

۱۱
درس

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

بندہ مومن کی شخصیت کے خدوخال

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمان خدام القرآن لاہور

بندہ مومن کی شخصیت کے خدو خال سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں



مقرر و مدرس
ڈاکٹر اسرار احمد



مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے ماؤل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

اس کتابچے کی اشاعت و طباعت کی ہر شخص کو کلی اجازت ہے

نام کتاب ————— بندہ مومن کی شخصیت کے خدو خال (درس ۱۱)
طبع اول (تمبر 1999ء) 2200
طبع دوم (جنوری 2005ء) 2200
ناشر ————— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقام اشاعت ————— ۳۶۔ کئائیں ناڈیں لاہور
فون: 5869501-03
طبع شرکت پرنگ پریس لاہور
10 روپے قیمت

بندہ مومن کی شخصیت کے خدو خل سورہ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

﴿ تَبَرَّكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ لِيْهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُبَيِّنًا وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيلَ وَالنَّهارَ خِلْفَةً لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هُوَنَا وَإِذَا حَاقَتْهُمُ الْجِهَلُونَ قَالُوا سَلَامٌ وَالَّذِينَ يَمْشُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقَوَافِعًا وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبُّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمِ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا وَإِنَّهَا سَاءَتْ مُشَتَّقَهَا وَمَقَامَاهَا وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُشْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ يَنْهَى ذَلِكَ قَوَافِعًا وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ الَّهَا أَخْرَى وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَرْتَنُونَ وَمَنْ يَفْعُلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَلَامًا يُضْعَفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مَهَانًا إِلَّا مَنْ نَعَّبَ وَأَمْنَ وَعِيلَ صَالِحًا فَأُولَئِكَ يَتَبَدَّلُ اللَّهُ سَيَّاتِهِمْ حَسَبَتْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا وَمَنْ نَعَّبَ وَعِيلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَنْهَا إِلَى اللَّهِ مَنَابًا وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الرُّؤْزَ وَإِذَا مَرَرُوا بِاللَّهِ مَرَرُوا كَرِاما وَالَّذِينَ إِذَا دُكْنُرُوا بِأَيْمَنِ رَبِّهِمْ لَمْ يَجْرُوا عَلَيْهَا صَمَّا وَغَنَّاتَا وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبُّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَرْوَاحِنَا وَذَرْ بَعْنَا قُرْةً أَعْنَنِ وَاجْعَلْنَا لِلْمُغَيَّبِنِ إِمَامًا أَوْ لَيْكَ يَعْجَزُونَ النَّزْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَنَلْقَوْنَ لِيْهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا خَلِيدِينَ لِيْهَا حَسَنَتْ

**مُشْبِقُوا وَمُفَاقِمُوا فُلْ مَا يَغْنُوا بِكُمْ رَبِّنَ لَوْلَا دُخَانُكُمْ فَلَقْدَ كَلَّتِنَمْ
فَسُوفَ يَكُونُ لِيَامَا) (الفرقان : ۶۱ - ۶۷)**

"بہت ہی بارکت ہے وہ سنتی جس نے آسمان میں بُرچ بنائے اور اس میں ایک
چماغ اور روشن چاند بنایا۔ اور وہی ہے کہ جس نے رات اور دن کو ایک
دوسرے کے تعاقب میں لکا دیا (اس میں نٹانیاں ہیں) ہر اس شخص کے لئے جو یاد
دہانی افذا کرنا چاہے یا شکر کی روشن احتیار کرنا چاہے۔ اور رحمان کے محبوب
بندے تو وہ ہیں جو زمین پر چلتے ہیں تو واضح اور نرمی کے ساتھ اور جب ان سے
جالیل لوگ اچھتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور وہ ہر اتنی بُر کرتے
ہیں اپنے رب کے حضور میں بُجہہ کرتے ہوئے اور دوست بُست کھڑے رہ کر۔ اور
وہ ہو یہ کرتے ہیں اے رب ہمارے! پھر دے ہم سے جنم کے عذاب کو۔ یقیناً اس
کا عذاب چھٹ جانے والی چیز ہے۔ یقیناً وہ بہت بُری جگہ ہے سُتھل جائے قرار
ہونے کے احتیار سے بھی اور عارضی قیام گاہ کے احتیار سے بھی۔ اور وہ جو جب
خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں نہ بھل سے، بلکہ ان کی روشن
اس کے میں میں ہوتی ہے۔ اور وہ ہو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معیود
کو، اور نہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو نہیں اللہ نے محترم فخر رایا ہے مگر حق کے
ساتھ، اور نہ زنا کرتے ہیں — اور جو کوئی بھی یہ کرے گا وہ اس کی پاداش
بھکت کر رہے گا۔ دو گناہ کر دیا جائے گا اس کے لئے عذاب کو قیامت کے دن اور
وہ اس میں رہے گا یہ شہادتیل و خوار ہو کر۔ سوائے اس کے جو توبہ کرے اور
ایمان لائے اور اچھے عمل کرے، تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ جھلائیوں
سے بدل دے گا۔ اور اللہ تو ہے ہی بُختے والا، رحم فرمائے والا۔ اور جو توہ کرے
ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو حیثیت دعی ہے جو انکی توبہ کرتا ہے چیز کے توہ کرنے
کا حق ہے — اور وہ جو جھوٹ پر اپنی موجودگی تک گوا رائیں کرتے اور اگر
کسی لغو کام کے پاس سے ان کا اتفاقاً گزرو جائے تو بھی دامن کو بچاتے ہوئے
گزرو جاتے ہیں۔ اور وہ جنہیں جب ان کے رب کی آیات کے ذریعہ صحت کی
جاتی ہے تو وہ اس پر اپنے ازربیرے ہو کر نہیں نوٹ پڑتے۔ اور وہ ہو یہ کہتے
ہیں کہ اے رب ہمارے! ہمیں اپنی یہو یوں اور اولاد سے آنکھوں کی مہنڈ ک عطا

فرما اور ہمیں اپنے نیک بندوں کے آگے پڑھے والا ہنا۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں بدله میں ہلا خانے ملئے گے بعوض اس میرے کے جوانوں نے کیا، اور دہاں ان کا استقبال ہوا گا نیک و عاول اور سلام کے ساتھ۔ وہ اس میں رہیں گے بیشہ بیش، اور وہ بہت ہی صدھ چکہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کی حیثیت سے بھی اور عارضی قیام کا ہوئے کے انتبار سے بھی۔ اے نبی! کہہ دیجئے : میرے رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے اگر نہ ہو تو ہمیں پکارتا۔ پس تم نے جھلادیا ہے تو آب یہ جھوٹ جلد تم پر لا گو ہو کر رہے گا۔“

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ دار مطالعہ ان صفات میں ہوا رہا ہے، اس کا درس نمبر اسورة الفرقان کی آیات ۶۱-۶۷ پر مشتمل ہے۔ اس منتخب نصاب کے پہلے حصہ میں چار جامع اسماق تھے۔ دوسرے حصہ میں کچھ ایسے مقامات تھے جن کے ذریعہ ایمان کے ضمن میں چند مباحث ہمارے سامنے آئے تھے۔ تیسرا حصہ میں اعمال صالحہ کی بحث ہے جو چھل رہی ہے۔ اس کے پہلے سبق میں ان اوصاف کا بیان تھا جو از روئے قرآن حکیم انسان کی سیرت کی تغیری یا بقول علامہ اقبال مرحوم تغیر خودی کے لئے بنیادی لوازم اور اساسات ہیں۔ زیر درس آیات کے مطالعہ اور ان کی ترجمانی سے آپ نے محسوس کر لیا ہو گا کہ گزشتہ سبق کی طرح یہاں بھی چند اوصاف کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس طرح سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع میں چھ مرتبہ ایم موصولہ "آلَّذِينَ" گمراہ کے ساتھ آیا تھا اور سورۃ الماعرج کی آن آیات میں کہ جو سورۃ المؤمنون کی آیات کی ہم مضون تھیں، آٹھ مرتبہ "آلَّذِينَ" کی گمراہ ہوئی، اسی طرح آج کے درس میں بھی "آلَّذِينَ" ایک مرتبہ آیا ہے اور "وَآلَّذِينَ" سات مرتبہ ذہرا یا گیا ہے کہ عباد اور حسن یعنی ہمارے محبوب بندوں میں یہ اوصاف ہوتے ہیں، ان کی یہ اور یہ کیفیت ہوتی ہے، ان کی راتمیں اس حال میں اور اس کیفیت میں بس رہتی ہیں، وہ جب خرچ کرتے ہیں تو ان کی روشنی ہوتی ہے، "وَغَيْرَهُمْ"۔

غور طلب ہات یہ ہے کہ گزشتہ سبق اور اس سبق کے مابین منطقی ربط کیا ہے؟ آپ نے محسوس کر لیا ہو گا کہ اس مقام پر ان اوصاف کا بیان ہو رہا ہے جنہیں ہم چونکے

اوصاف کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ایک پوری طرح تربیت یافتہ خودی یا ایک پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت کے یہ خدو خال ہونے چاہئیں۔ ایک بندہ مومن کے جو نمایاں اوصاف اللہ کو پسند ہیں، ان کا اس سبق میں نہایت جامع بیان آیا ہے۔ اسے ایک مثال سے واضح کیا جائے تو وہ یہ ہو گی کہ یہی ہم ایک عمارت بناتے ہیں تو اس کا ایک ڈھانچہ (Structure) ہوتا ہے، جس میں سینٹ، لوہا، سریا اور لکڑی وغیرہ استعمال ہوتی ہے، اور عمارت کی اصل مفہومی اور اس کا اصل استحکام اس کے Structure کی مفہومی پر ہوتا ہے۔ پھر اس عمارت کی Finishing اور اس کی آرائشی ہے۔ یعنی عمدہ پلاسٹر ہو، رنگ و روغن اعلیٰ ہو اور اس عمارت کے خدو خال کی خوبصورتی مختلف پہلوؤں سے ظاہر ہو رہی ہو۔ ظاہریات ہے کہ جب آپ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس کا شرکر نکالوں کے سامنے نہیں آتا۔ وہ تو ایک مغلی اور نظروں سے او جھل شے ہے۔ جو چیز سامنے آئے گی وہ اس کے نمایاں خدو خال ہیں۔ اگر عمارت دل آویز ہے، خوبصورت ہے، پلاسٹر اچھا ہو اے، رنگ و روغن عمدہ ہے تو وہ زیدہ زیب ہو گی اور آپ کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے گی۔ بالکل یہی ربط و تعلق ہمارے سابقہ سبق اور اس سبق میں ہے۔ یوں سمجھتے کہ سیرت و شخصیت کی تعمیر کا اساسی پروگرام تو وہ ہے جس پر ہم دو مقامات کے حوالے سے غور کر چکے ہیں، لیکن ایک مکمل تعمیر شدہ انسانی شخصیت میں، جس کی تعمیر علامہ اقبال مرحوم نے یوں کی ہے کہ طریقے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن!

یہ دل آویزی جن اوصاف سے پیدا ہوتی ہے اُنہیں اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نہایت جامیعت کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔

سب سے پہلے ہم اس سبق کی دو آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے ہمن میں جو بھیشیں اس سے قبل اس سلسلہ دروس میں ہو چکی ہیں، ان کا نہایت جامع خلاصہ ان دو آیات میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿ تَبَرَّكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاوَاتِ بُرُوزًا وَجَعَلَ فِيهَا سَرَاجًا وَقَمَرًا مُبِينًا ﴾

”بُرُوزی ہابرکت ہے وہ ذات جس نے آسماؤں میں بُرُوز بنائے اور اس (آسمان)

میں ایک جگہ روشن کیا (یعنی سورج) اور روشن ہاندھایا۔“

(وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيلَ وَالنَّهَارَ خَلْفَةً)

”اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا۔“

گویا وہ ایک دوسرے کا پچھا کر رہے ہیں۔ رات دن کا پچھا کرتی ہوئی چلی آتی ہے اور دن جیسے رات کا تعاقب کرتے ہوئے نمودار ہوتا ہے۔ یہ قانون طبی کی ایک بین حقوقیت ہے۔ اسے سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں آیاتِ الیہ سے تعبیر کیا گیا تھا : ﴿إِنَّ فِي خُلُقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْخِلَافِ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَآيَاتٍ لِّاُولَى الْأَلْفَابِ﴾ اور اس موقع پر ہم نے سورۃ البقرۃ کے اکیسویں رکوع کی پہلی آیت (البقرہ : ۱۶۳) بھی تفصیل سے پڑھی تھی کہ اس کائنات کی ہر شے ایک نشانی ہے جس کو دیکھ کر لا حمالہ ایک سلیمان الفطرت اور سلیمان العقل انسان کا ذہن اس کے خالق، اس کے مالک، اس کے صانع اور اس کے مصور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس کائنات کے مشاہدات سے اس ذات کی صفاتِ کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو اس کائنات کا بناۓ والا ہے، وہ جو ”علیٰ کُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ ہے، اس کی قدرت میں کہیں کوئی کمی نہیں، اس کے علم میں کہیں کوئی کمی نہیں، اس کی حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں، وہ ”بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ ہے، اور وہ ہستی ”الْغَفِيرُ الْحَكِيمُ“ ہے۔

یہ درحقیقت وہی مضمون ہے جسے یہاں بھی تمہید کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان آیات آفیتیہ پر غور و تدبر کرتے ہیں، جسے علامہ اقبال نے اس طرح تعبیر کیا کہ تو

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

شرق سے آبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

وہ لوگ جو اس وسیع و عریض کائنات میں پہلی ہوئی آیات سے اس کے خالق کی معرفت حاصل کرتے ہیں، انہی میں یہ اوصاف پیدا ہوں گے کہ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت کے آخر میں فرمایا :

(لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا ۝)

”(یہ نہایاں ہیں) اس کے لئے جو ہاہے تو یاد دہانی حاصل کرے یا ہاہے تو (اللہ کا) شکر گزار بنے۔“

ان الفاظ مبارکہ سے آپ کے ذہن میں سورۃ القمان کے دوسرے روکوں کا مضمون آکیا ہوا گا کہ کائنات کے مشاہدہ سے جہاں تذکرہ حاصل ہوتا ہے، یاد دہانی نسبت ہوتی ہے، ذہن اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے، اس کے احسانات کا اور اک حاصل ہوتا ہے کہ اس نے انسان کی روزی کی فراہی کے لئے کیا عظیم الشان انعام بنا یا ہے! اس نے انسان کی ہر ہر ضرورت کی بہم رسانی کے لئے کیا اعلیٰ انتقام و انصرام فرمایا ہے! وہ انسان کے جسم و جان کے تمام تقاضوں کو کس کس طریقہ سے پورا فرمایا ہے۔ اس شعور و اور اک سے ایک دوسرے اجذبہ جو انسان کے دل میں ابھرتا ہے وہ چند ہے شکر ہے۔ سورۃ القمان کے دوسرے روکوں کی پہلی آیت ذہن میں تمازہ کیجئے :

﴿وَلَقَدْ أَتَيْنَا الْفُلْمَنِ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ﴾

”ہم نے القمان کو حکمت اور دنائلی عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا!“

تو معلوم ہوا کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے اور آیاتِ ساوی، آیاتِ ارضی، آیاتِ آفاقی اور آیاتِ نفسی سے ایک سلیم البطرت اور سلیم العقل انسان کو دو چیزوں اخذ کرنی چاہئیں — ایک وہ جسے قرآن کریم تذکرے سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اس کائنات کی وسعتوں میں انسان کی نہایں الجھ کرنے رہ جائیں، بلکہ ان کو دیکھ کر ان پر غور و تذہب سے اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا صاحب، اس کا مصور اور اس کا مدبر یاد آجائے اور ذہن و شعور اور عقل و اور اک اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے —

گاہ مری لگاہ تیز جھر گئی دل وجود

گاہ الجھ کے رہ گئی میرے تھات میں!

تو دل کی آنکھ سے اس کائنات کے ذریعے اللہ تک پہنچا جائے تو اس کا نام تذکرے ہے — اور دوسرے یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اور اک ہو، اس کے احسانات کا شعور

ہو، جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کے دل میں تفکر کے جذبات وجود میں آئیں۔ ان دونوں کے لئے یہاں فرمایا گیا : ﴿لَعْنَ أَرَادَانْ بِلَدَكُرْ أَوْأَرَادْشُكُورَا (۵۰)﴾ اس روکوں کی پہلی دو آیات کا مضمون سمجھ لینے کے بعد اب ہم اگلی پانچ آیات (الفرقان : ۶۳۔ ۶۷) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے اوصاف بیان فرمار رہا ہے جو اسے بہت ہی پسند اور محبوب ہیں۔ چنانچہ سنگتوں کی جوابتداء ہوئی ہے وہ ﴿عِبَادُ الْأَرْضِ﴾ کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے "الْأَرْضِ" نہایت پیارا نام ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ رحمت سے مشتق ہے؟ اور ظاہریات ہے کہ بندوں کو جس چیز کی زیادہ احتیاج ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اگرچہ رحمت سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام اور بھی بتاتا ہے اور وہ ہے الرحیم — لیکن "الرحیم" میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی شان ایک مستقل اور دائم حقیقت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے، جبکہ "الْأَرْضِ" میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جو شان سامنے آتی ہے وہ ایک خاصیں مارتے ہوئے سند رکے ماندہ ہے، جس میں جوش و خروش ہو، جس میں ہیجان ہو۔ یہ لفظ ہیجان بھی فلان کے وزن پر عربی ہی کا لفظ ہے۔ اسی وزن پر عربی زبان میں متعدد الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً عظمت، انتہائی پیاسا، جس کی پیاس سے جان نکلی جا رہی ہو — جو عان نہایت بھوکا، جو بھوک سے مر رہا ہو — تو اللہ تعالیٰ کا یہ نام نہی، اس کو ای "الْأَرْضِ" بھت ہی پیارا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک خاصیں مارتے ہوئے سند رکی طرح سامنے آتی ہے۔

پھر "عِبَادُ الْأَرْضِ" کے فرمانے میں بھی ایک محبت اور شفقت و عنایت کا اندازہ ہے یعنی اللہ کے محبوب بندے، اللہ کے پسندیدہ بندے یہ ہیں جن میں یہ اوصاف پائے جاتے ہوں جن کا ذکر آگئے آ رہا ہے۔

ان اوصاف میں سے پہلا صرف آیا : ﴿أَلَّدِينَ يَنْهَا نَعَلَى الْأَرْضِ هُنَّا (۵۱)﴾ وہ لوگ جو زمین پر چلتے ہیں آہنگی سے، زری سے۔ ان کی چال سے تواضع نہایاں ہوتی ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ چیزے اگر بزری میں کہتے ہیں کہ "Face is the index of the mind" آپ کسی انسان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے باطنی

احسات و جذبات کا اندازہ کر سکتے ہیں، اسی طرح انسان کی حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں غرور ہے، یہ کسی غریب جلا ہے، یہ حمنڈی ہے۔ اکثر کرچے گا تو اس کی حال تباہی کی کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے! یا پھر اس کی حال سے یہ ظاہر ہو گا کہ اس میں بعزو تو اضطراری، اکساری اور خاکساری ہے۔ تو یہ ہے پلاوصاف — اور بندے کو یہ حقیقت بچان لئی چاہئے کہ میں بندہ ہوں، آقا نہیں ہوں، آقا تو صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے، باقی بڑے سے بڑا انسان بھی بندہ ہے، اور عبادت ہی در حقیقت ہمارا طرہ امتیاز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے خصوصی حکایت کے ساتھ خطاب فرمایا ہے، یا آپ "کاذک" خصوصی محبت و شفقت اور التفات کے ساتھ فرمایا ہے وہاں حضور ﷺ کی عبادت کو نمایاں کیا جاتا ہے — جیسے : «شَبَّحْنَ اللَّهُ أَسْرَى بِقَبْدِهِ لَيْلًا وَنَّ الصَّسْجِدَ الْخَرَامَ إِلَى الصَّسْجِدَ الْأَقْضَى» اور : «الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ» اور جیسے : «تَبَرَّكَ اللَّهُ أَلْيَ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِتَكُونَ لِلْغُلَمَانِ نَذِيرًا» (۵۰) دیکھئے کس قدر لطیف ربط ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ اس سورہ مبارکہ کی پہلی آیت ہے جس کے آخری رکوع کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورہ مبارکہ کے آخری رکوع کا آغاز بھی "تَبَرَّكَ اللَّهُ أَلْيَ" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ آغاز میں فرمایا گیا : "بڑی باری کت" بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (ملائکہ) پر الفرقان (یعنی قرآن مجید) نازل فرمایا۔

تو یہ عبادت در حقیقت صراحی انسانیت ہے۔ لہذا یہاں "عبدُ الرَّحْمَن" فرمانے میں بڑی شفقت، محبت، حکایت اور التفات کے پبلو مضمون ہیں۔ مراد ہیں وہ لوگ جو واقعی اللہ کے بندے ہیں، ان کی حال ڈھال سے نمایاں ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بندہ ہی سمجھتے ہیں، آقا نہیں سمجھتے۔ یہ اپنے آپ کو ملکوں سمجھتے ہیں اور اپنے مالک، اپنے آقا کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ان کی حال گواہی دیتا ہے کہ غرور و غرور کے بجائے ان میں بعزو تو اضطراری کے احسات و جذبات جائز ہیں۔

ہمارے اس منصب نصاب کا جو تیرا درس سورہ القمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے، اس کے آخر میں بھی اسی وصف پر زور دیا گیا ہے : «وَلَا تُضْعِفْ خَدْكَ لِلثَّانِي

وَلَا تُنْهِي إِلَيْهِ الْأَذْرِقَ مَرْخًا إِنَّ اللَّهَ لَا يَجْعَلُ كُلَّ مُفْتَحًا فَغُورٍ ۝) حضرت لقمان اپنے بچے کو صحیح فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اے میرے بچے! اپنے گال لوگوں کے لئے پھلا کر نہ رکھ اور زمین پر اکڑ کر مت ہیں۔ بے شک اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں۔ شنجی خورے اور اترانے اور غرور و غیرے کام لینے والے۔" تو یہاں نقطہ آغاز وہ وصف ہے جہاں سورہ لقمان کے دوسرے روکوں کے مضامین کی قرباً انتہا ہوئی تھی۔

اسی آیت میں دوسرا وصف بیان ہوا ہے : ﴿ وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجِهَلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۝) اور جب جمال ان سے الجھنا چاہتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر ان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں" — یہ بھی درحقیقت انسان کی شخصیت کی پچھلی کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ بعض لوگ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر لوگوں سے بے کاری بحث و تجویض میں الجھ جاتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی بحث و مباحثہ کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ایک پختہ (انسان کا لازمی و صفت یہ ہو گا کہ وہ اندمازہ کرے کہ اس کا مخاطب اس وقت بات سمجھنے کے موڈ (mood) میں ہے یا محض بحث و نزاع پر تلا ہوا ہے، اور اگر وہ یہ محسوس کرے کہ یہ شخص اس وقت افہام و تفہیم کے موڈ میں نہیں ہے، یہ میری بات کو سمجھیدگی سے نہیں سن رہا، یہ ضد اور عنادمیں جلا ہو چکا ہے، اس وقت اس پر ہٹ دھری مسلط ہو چکی ہے، یہ خواہ خواہ مجھ سے الجھ رہا ہے، بات کو سمجھنا اس کے پیش نظر سرے سے ہے یعنی نہیں، تو بڑی خوبصورتی سے سلام کہہ کر اس سے علیحدہ ہو جائے۔ بعض جوشیتے قسم کے بُلْغَمْ ایسے موقع پر تجھی پر اتر آتے ہیں، تیل کلای اختیار کر لیتے ہیں، یا علیحدہ بھی ہوتے ہیں تو اس طور سے گویا اللہ مار کر علیحدہ ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ لکھتا ہے کہ پھر دوبارہ گفتگو کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ خوبصورتی کے ساتھ علیحدگی اختیار کریں تو موقع رہے گا کہ آپ آئندہ کسی مناسب وقت پر جب یہ محسوس کریں کہ یہ شخص سمجھنے کے موڈ میں ہے تو اس کے سامنے دوبارہ اپنی بات رکھنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بڑی سی پختہ اور mature شخصیت کے نمایاں اوصاف میں سے ہیں، جن سے یہاں افتکو کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس کے بعد فرمایا : ﴿ وَالَّذِينَ يَتَبَرَّزُونَ لِزِيَّهُمْ سُجَدًا وَقَيَّامًا ۝) اور جو راتیں بر

کرتے ہیں اپنے رب کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بست کھڑے رہ کر۔

— اب یہاں ایک فوری تقابل (Simultaneous Contrast) آپ کے سامنے رہے۔ ہمارے سابقہ درس میں نماز کا ذکر ہار بار آیا تھا : «قَذَّافَلَحُ الْمُزَمِّنُونَ ۝ الَّذِينَ

﴿هُمْ فِي صَلَاةٍ يُهْمِلُونَ ۝﴾ اور پھر ان اوصاف کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوا :

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ حَلَائِبِهِمْ يَنْخَالِفُونَ ۝﴾ ابتداء بھی صلوٰۃ کے ذکر سے اور اختتام بھی

صلوٰۃ کے ذکر پر۔ پہلے صلوٰۃ میں خشوع کا ذکر ہے جو اس کی بالطفی روح ہے اور آخر میں صلوٰۃ کی محافظت اور داداً و مت کا ذکر ہے — لیکن یہاں رات کی نماز یعنی تجدیہ کا ذکر ہے۔

اس لئے کہ ایک مسلمان میں جو بنیادی اوصاف درکار ہیں جن سے تغیریت کا وہ

پروگرام وجود میں آتا ہے جو قرآن مجید دیتا ہے، اس کی ابتداء و انتاء اقامت الصلوٰۃ یعنی

نماز مہجانہ کا اہتمام ہے جو فرض ہے۔ اس کی پابندی کرنا، اس کے تمام آداب اور جملہ

شرائط کے ساتھ اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہاں بات بالکل دوسری

ہے۔ یہاں تو اس سلسلہ کی مفتگو ہو رہی ہے جہاں ایک انسان اللہ تعالیٰ کی محبوّیت کا مقام

اور درجہ حاصل کر لے۔ یہاں جس نماز کا ذکر ہے وہ رات کی تمامی کی نماز ہے :

﴿وَالَّذِينَ تَبَيَّنُوا لَرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝﴾ یعنی ان کی راتوں کا نقشہ ان لوگوں کی راتوں

کی کیفیت سے بالکل مختلف ہے جو غلطات میں پڑے ہوئے ہیں، جو پوری رات پاؤں پھیلا کر

سوتے ہیں۔ ان کو اس غلطات کا احساس تک نہیں ہوتا کیونکہ ان کے دل میں کوئی گن

نہیں ہے، ان کے دل میں اللہ کی محبت کا جذبہ نہیں ہے — لیکن جن لوگوں کے دلوں

میں اللہ تعالیٰ کی محبت گرفتہ ہو ان کو ان کا وہ جذبہ محبت رات کے وقت سونے نہیں

دیتا۔ وہ رات کو بار بار اٹھتے ہیں، اپنے رب کے حضور دست بست کھڑے ہوتے ہیں یا

اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی رات کی نماز کی کیفیات کے

متعلق ہمیں روایات میں یہ نقشہ ملتا ہے کہ آپ راتوں کو بار بار اٹھتے تھے، چونکہ جو کہ کر

اٹھتے تھے اور آپ اپنے رب کے سامنے نمازوں میں دست بست بست کھڑے ہوتے تھے، سجدہ ریز

ہوتے تھے۔ بندہ مومن کی شخصیت کے تکمیلی اوصاف میں یہ رات کی نماز یعنی تجدیہ یا قیام

اللیل عظیم ترین اہمیت کی حامل ہے — اور اساسی و بنیادی اوصاف میں سب سے

زیادہ اہم و مفہومیت الحکومت، یعنی بخش و قدر فرض نماز کی پابندی ہے۔ ظاہرات ہے کہ جو لوگ رات کے وقت کی اس نماز کی پابندی کر رہے ہوں، کیسے ممکن ہے کہ وہ فرض نمازوں کے نظام میں کسی درجہ میں بھی کوتایی یا غلطت سے کام لیں ۔۔۔ !!

اس کے بعد فرمایا کہ اپنے رب کے سامنے اس قیام اللیل کے نتیجہ میں جو دعا ان کے دل سے نکل کر زبان پر آتی ہے وہ یہ ہے کہ «زَبَّاتَا اضْرِيفَ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ» اے رب ہمارے! ہمیں جنم کی سزا سے بچا، اس کو ہم سے ڈور کر دے۔ اس میں درحقیقت اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جہاں حقوق کے سامنے ان کی روشن تواضع اور فروتنی کی ہوتی ہے، وہاں وہ اپنے رب کے سامنے بھی نہایت عاجزی کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ انسین اپنی میکلی پر کوئی غرور نہیں ہوتا۔ وہ کسی زخم یا گھمنڈ میں جلا نہیں ہوتے، بلکہ ان کو یہ شدید گردان میگیر رہتی ہے کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے بیان قبول ہو رہے ہیں یا نہیں! لہذا ان پر ایک لرزہ طاری رہتا ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النور کے پانچیں رکوع کی آیات میں آچکا ہے کہ وہ لوگ اپنے رب کے عذاب سے خائب رہتے ہیں، لرزائی و ترسائی رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم کبار صحابہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کے حالات میں یہ پڑتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق ہبھاؤ ایک عجیب کیفیت کے حالم میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش! میں گھاس کا ایک ٹکڑا ہو جاؤ گلداریا جائے اور اس سے کوئی حساب کتاب نہیں ہو گا۔ کاش! میں درختوں پر چھمانے والی ایک چیز یا ہو جاؤ گلداریا جائے اسے کوئی ہم ختم ہو گا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ویسے تو آپ کا جسم بہت گٹھا ہوا اور بڑا مضبوط تھا لیکن جب آپ نمازوں کھڑے ہوتے تھے تو جنم خشیت الہی سے نہایت زرم پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کے جسم میں ایک تیر پوسٹ ہو گیا جو نکالے نکل نہیں رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے نماز کی نیت پاندھ لینے دو، اس حالت میں تیر نکال لیتا۔ یہ ہے وہ کیفیت: «وَالَّذِينَ يَقُولُونَ زَبَّاتَا اضْرِيفَ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ» اس کے ساتھ ہی فرمایا: «إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَّاً فَاتِاً» یہ جنم کا عذاب تو چھٹ جانے والی چیز ہے، یہ عذاب تو جان کو لا گو ہو جانے والا ہے، اس سے انسان کو چھٹکارا نہیں ملے گا۔ آگے جنم کے بارے میں الفاظ آئے ہیں: «إِنَّهَا

سَأَةٌ مُشْتَقَرٌ وَمُفَعَّلٌ۝) "بِعِنْدَهُ مُشْتَقَرٌ بَعِيْهُ اَوْ مُفَعَّلٌ بَعِيْهُ" - عربی زبان میں "مشتر" جائے قرار کو کہتے ہیں "جہاں انسان کا مستقل مکان ہو۔ اردو میں بھی مشتر اسی معنی میں مستقل ہے — اور "حَقَّ" کے معنی ہیں قیام کی جگہ۔ جہاں بھی تھوڑی دیر کے لئے انسان رکتا ہے وہ اس کا مقام ہے۔ تو ان الفاظ کے ذریعے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ جسم اتنی بُری جگہ ہے کہ اگر کسی کی مستقل جائے قرار بن جائے تو اس کی بُریادی، رسائی اور ہلاکت کا ذکر ہی کیا ہے؟ یہ تو اتنی بُری جگہ ہے کہ اس میں اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی قیام ہو تو یہ اپنی قیام ہو لتا کیاں اور سختیاں پورے طور پر ظاہر کر دے گی۔ عام طور پر ہمارا یہ تصور ہے کہ کسی اچھی سے اچھی جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اس میں دلچسپی اور رخائی نہ رہے گی، انسان آکتا جائے گا، اور بُری سے بُری جگہ پر بھی انسان اگر تھوڑی دیر کے لئے چلا جائے تو یہ تبدیلی اس کے لئے تفریح کا ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن یہاں آپ الفاظ دیکھیں گے : «إِنَّهَا سَأَةٌ مُشْتَقَرٌ وَمُفَعَّلٌ۝) — اور اس رکوع کے آخر میں جنت کے بارے میں آئے گا : «خَسْنَتْ مُشْتَقَرٌ وَمُفَعَّلٌ۝) یہ بھی ایک فوری تفہیل کے لئے ہے کہ جنت اتنی اچھی جگہ ہے کہ انسان اس میں بیش کے لئے رہے گا تب بھی اس جنت کی رحمائیوں، دل آدمیوں، کلاؤں اور دلچسپیوں میں اسے کوئی کی محوس نہیں ہو گی، انسان آکتا گا نہیں، اور جسم اتنی بُری جگہ ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اگر کسی کو اس میں داخل کر دیا جائے تو وہ اپنی ساری شدتیں، اپنی ساری غلطیں، اپنی ساری کلختیں آئیں واحدها میں ظاہر کر دے گی۔

اس سے بعد فرمایا "وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔" یہ بھی صفتیت کی پختگی اور بالغ نظری کی علامت ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ اگر ایک وقت ہاتھ کشادہ ہے تو انسان اللوں تللوں میں پیسہ اڑا دے اور اگر کسی وقت تخلی ہو گئی ہو تو انسان بالکل بمحض کرہ جائے — اور نہ ایسا ہو کہ جہاں خرچ کرنا لازمی اور ضروری ہو وہاں وہ ہاتھ روک لے، یہ بختی ہے — ان تین رویوں کے بجائے ایک بین بین اور معتدل روشن اختیار کرنا ایک اعلیٰ وارفع و صاف ہے۔ لہذا فرمایا : «وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا مَمْسُورٍ فَلَوْا» "وہ لوگ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں" «وَلَمْ

بَقْتُرُوا) ” اور نہ بگل سے کام لیتے ہیں ” بلکہ : (وَكَانَ يَقِنَ ذَلِكَ قَوْمًا) ” ان کا طرز عمل اس کے نہیں ہوتا ہے ”۔ یہ بات بھی سورہ لقمان کے دوسرے روکوں کے آخر میں آئی تھی : (وَالْفَيْضُ فِي مَشِيلٍ) ” اپنی ڈھال میں میانہ روای اختیار کر ”۔ یہاں ڈھال ڈھال میں بھی اعتدال مراد ہے اور خرچ میں بھی — تو وہی وصف ہے جو یہاں ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوا ۔

اگلی دو آیات میں فرمایا :

﴿ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا أَخْرَى وَلَا يَقْتَلُونَ النَّفْسَ إِلَّى حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَرْثُونَ ، وَمَنْ يَقْعُلْ ذَلِكَ يَنْلُقُ أَنَّامًا ۝
يُضَعَّفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا ۝﴾

” اور وہ لوگ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معبدوں کو ” اور نہ وہ قتل کرتے کسی جان کو جسے اللہ نے محترم نہ رہا یا ہے مجرم کے ساتھ ” اور نہ وہ زنا کرتے ہیں ” اور جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اس کی پاداش پائے گا ۔ دنکا کیا جائے گا اس کے لئے عذاب کو قیامت کے دن ” اور وہ رہے گا اس میں یہی شہنشہ نہایت ذلیل و خوار ہو کر ۔ ”

آن شبہت اوصاف اور شبہت اقدار کے ذکر کے بعد جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں ” جن سے ایک بندہ مومن کی شخصیت میں دل آؤزی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور جو ایک مومن کی شخصیت کی پچھلی اور ” maturity ” کی علامات ہیں ” اب ان دو آیات میں اندرازیاب ملتی ہے ۔ یعنی عباد الرحمن میں یہ چیزیں بالکل نہیں ہوتیں ” وہ ان چیزوں کے قریب بھی نہیں پہنچتے ۔ ”

اس سلسلے میں قرآن مجید کی حکمت کا ایک اہم باب ہمارے سامنے آ رہا ہے کہ وہ کون کون سے کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مخفوب اور مبغوض ہیں ” جن سے وہ سخت ناراض ہوتا ہے اور جن سے اس کاغظ و غصب شدید ترین طور پر بھڑکتا ہے ۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارے یہاں جو یہ تصور ہے کہ ایک گناہ کبیرہ ہوتے ہیں اور ایک گناہ صغیرہ ہوتے ہیں — تو ہم سمجھیں کہ کبیرہ گناہوں میں چونی کے گناہ کون

سے ہیں؟! ان دو آیات میں سے پہلی آیت چونی کے تین گناہوں کو مسمیٰ کر رہی ہے۔ یعنی اس ایک آیت میں کہاڑیں سے درجہ درجہ تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر ہے۔ سب سے کبیرہ گناہ، عظیم ترین گناہ، جس کے ہمارے میں سورۃ النساء میں دو مرتبہ یہ الفاظ دارد ہوئے : ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْهَا عَنِ الْمُشْرِكَةِ بِهِ وَيَنْهَا عَنِ الدُّنْيَا فَذَلِكَ لِتَنْهِيَ إِيمَانَهُ﴾ "اللہ اس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کتر (گناہ) جس کے لئے چاہے گامعاف فرمادے گا" — گویا قرآن مجید کی رو سے ہمارے دین میں سب سے بڑا جرم، سب سے بڑا اور قطعیٰ تاقابلٰ معافی گناہ شرک ہے۔

سورۃ الحم کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں "اقلام شرک" کے موضوع پر کچھ مختصر لکھکو ہوئی تھی کہ ایک شرک ہے شرک فی الذات۔ یعنی اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھراانا۔ اور ایک شرک وہ ہے جو اللہ کی صفات کے ضمن میں ہے۔ یعنی شرک فی الصفات — اور تیرا شرک ہے شرک فی العبادات۔ اور نبی اکرم ﷺ نے حبادت کے لوتے لباب کی حیثیت دعا کو دی ہے : **اللَّدُغَاءُ مُنْعِظُ الْعِبَادَةِ** اور **اللَّدُغَاءُ هُوَ الْعِبَادَةِ**۔ "دعای حبادت کا اصل جو ہر ہے" اور "دعای حبادت کا اصل جو ہے"۔ اللہ ایساں آپ نے دیکھا کہ فرمایا : ﴿وَالَّذِينَ لَا يَنْدَعُونَ مَعَ اللَّوْلَاهِ أَخْرَى﴾ "وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے"۔ یہ پکارنا کس مقصود کے لئے ہوا ہے؟ ظاہر ہے کہ استرداد، استدھاء، استخاش اور استحانت کے لئے۔ یعنی کسی کو پکارنا اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے — پکارنا کسی کو اپنی کسی مصیبت کو دور کرنے کے لئے — پکارنا کسی کو اپنی حاجت روائی کے لئے — پکارنا کسی کو اپنی مشکل کشائی اور دشمنی کے لئے — پکارنا کسی کو اپنی مدد و اعانت کے لئے۔ غور کیجئے کہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ "اللہ کو چھوڑ کر کسی اور معبود کو پکارے" بلکہ "اللہ کے ساتھ کسی کی اور کو پکارنا" یہ شرک ہے۔ پس یوں سمجھئے کہ ہمارے دین میں شرک تو اکبر اکہاڑہ ہے۔ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا کبیرہ گناہ شرک ہے۔ چنانچہ آغاز میں سب سے پہلے تو اسی کا ذکر ہوا۔ اس لئے کہ درحقیقت شرک سے انسان کا نقطہ نظر غلط ہو جاتا ہے۔ گویا پہلی اہمیت عی شیز ہی لگ گئی تو اس کے بعد اس کا جو نتیجہ لگے گا وہ ظاہر ہے کہ —

خششت اول چوں نہ مغار کج
ما شریا می رو دیوار کج

بھر تو کجی ہی کجی ہو گی۔ انسان کی اپنی ذاتی سیرت میں بھی کجی ہو گی۔ ایسے لوگوں پر مشتمل جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ بھی کج ہو گا۔ لہذا یہاں سب سے پہلے شرک کا ذکر ہوا۔

دوسرے بڑے گناہ کا ذکر کیاں الفاظ ہوا : ﴿وَلَا يُفْتَأِلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا
بِالْحَقِّ﴾ — اس کا تعلق انسانی جان کے احترام سے ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ شرک

کے بعد سب سے بڑا گناہ قتل عمد ہے۔ اس لئے کہ تمدن کی جزو کت جاتی ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک متدن حیوان ہے، انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ "Man is a Gregorious Animal"

تمدن اور حضارت مل جل کر رہنے سے ہی وجود میں آتی ہے، اور اس کی جزا اور بنیاد یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کی جانوں کا احترام کریں۔ اگر احترام جان ہی ختم ہو گیا تو کوئی جان کی اساس ہی متقدم ہو گئی۔ لہذا تمذیب و تمدن کی بنا کے لئے لازم ہے کہ معاشرے کے اندر احترام جان کا پورا پورا احترام و احترام رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بت محرم نہ کرایا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض ایسی صورتیں ہیں کہ جان کوئی شخص قانون کی زد میں آکر قتل کا مستوجب قرار پائے گا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

شریعت میں ﴿إِلَّا بِالْحَقِّ﴾ کی مصادق چار صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ قتل عمد کی صورت میں اگر مقتول کے وارث دیت یا خون بھا لینے کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں اور معاف کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں تو جان کے بد لے جان لی جائے گی : ﴿إِنَّ النَّفْسَ
بِالنَّفْسِ﴾ دوسری یہ کہ کوئی شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے تو شریعت میں اس کے لئے رجم کی سزا ہے کہ اس کو سنگار کیا جائے ۲۳ آنکہ وہ ہلاک ہو جائے۔ تیسرا یہ کہ اسلام میں ارتکاد کی سزا قتل ہے۔ چوتھی یہ کہ وہ کافر جو حربی ہو، جس کے ساتھ باقاعدہ اور اعلانیہ جنگ ہو رہی ہو۔ کسی اسلامی ریاست کا پر امن ذی یا معاہدہ غیر مسلم اس کا مصادق نہیں بن سکتا۔ اس کی جان تو اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی مسلمان کی جان ہے۔ اسے وہی تحفظات حاصل ہیں جو کسی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ جان گلزارو

مشرکین کے ساتھ جگہ ہو رہی ہو دہاں کافر کی جان مومن کے لئے حلال ہو گی ۔ ان چار صورتوں کے سوا کسی بھی حالت میں انسانی جان کا لیتا قتل ناحق ہو گا ۔ اور اس آیت مبارکہ کی رو سے قتل ناحق کے متعلق یہ جان بچج کر دین اسلام کے نظام میں شرک کے بعد یہ سب سے بڑا جرم ہے۔

تیری بات فرمائی کہ ﴿وَلَا يُنْهَىٰنُ﴾ "اور وہ زنا نہیں کرتے" ۔ ہم اس سے پہلے سورۃ المؤمنون اور سورۃ العارج کی بعض آیات کے درس میں دیکھے چکے ہیں کہ اپنے شووانی جذبات پر قابو پانے (Sex Discipline) کی کتنی اہمیت بیان ہوئی تھی ۔ دونوں مقامات پر فرمایا : ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لَفْرُوجُهُمْ حَفِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَرْزُوا ۝ إِنَّمَا لَكُثُرَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مُلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَآءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْغَدُونَ ۝﴾ یہاں وہی بات ہے لیکن اسلوب منفی ہے ۔ دہاں مشتبہ پلوے سے بیان کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی شرماگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی شوت پر قابو یافتہ ہیں، حلال راست کے علاوہ اپنی شوت کی تکین کے لئے کوئی حرام راست اختیار نہیں کرتے ۔ یہاں وہی بات منفی اسلوب سے بیان فرمائی کہ "وہ زنا نہیں کرتے" ۔ البتہ یہاں جس سیاق (Context) میں یہ بات آئی ہے اس سے ہمارے سامنے یہ عظیم حقیقت آتی ہے کہ قتل ناحق کے بعد سب سے بڑا جرم زنا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں یہ فعل بدرواجح پا جائے اس میں سے اعتماد باہمی اور محبت والفت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے ۔ اس لئے کہ باہمی محبت کا سرچشمہ ایک شوہر اور اس کی بیوی کے مابین اعتماد کا احساس ہے ۔ اگر یہ اعتماد موجود ہے تو محبت بھی ہو گی، مودت بھی ہو گی اور یہ خاندان اس دنیا میں جنت کے باخپوں میں سے ایک باغیچہ کی کیفیت کا مظہر بن جائے گا ۔ لیکن اگر کسی معاشرے میں بد چلنی کا روزاج ہو جائے، شوہر کو بیوی پر اعتماد نہ رہے اور بیوی کا شوہر پر اعتماد اٹھ جائے اور یہ اعتمادی باہمی اعتماد کی جگہ لے لے تو اس معاشرے میں اعلیٰ اوصاف کبھی ترقی نہیں کریں گے ۔ جو نئی نسل اس گھر میں پرورش پائے گی، اس میں حسنات اور اعلیٰ اخلاق کبھی بھی نشوونما نہیں پاسکیں گے، بلکہ ایسے ماحول میں پرورش پانے والی نسل میں ایک منفی کردار پیدا ہو جائے گا ۔ تو گویا زنا دہ چیز ہے جو تمدن میں حسن و خوبی کے پھول کھلانے کے بجائے اسے ایک

متعفن سڑاں پا کر رکھ دے گی۔ لہذا تیسرا جیزہ ہے : «وَلَا يَنْزَهُنَّ» "اور وہ زنانیں کرتے"۔

ان تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا : «وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يُنْلِقَ أَثَاماً» جو کوئی بھی ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرے گا — یعنی شرک کرے گا، اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے پکارے گا، کسی اور کسی بھی عبادت کرے گا، یا وہ انسانی جان ناچن لے گا، انسانی خون ناچن بائے گا، یا وہ زنا کرے گا — تو وہ جان لے کر اس کی پاداش اس کو بھکتنی پڑے گی : "یُنْلِقَ أَثَاماً" — وہ یہ نہ سمجھے کہ نفع نکلے گا، کوئی گرفت نہیں ہے، کوئی سزا نہیں ہے۔ اگر اس دنیا میں اسے سزا نہیں ملی تو آخرت میں اسے اس کا بھرپور خمیازہ بھکتا پڑے گا۔

اگلی آیت میں فرمایا : «يَنْصُفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ» "قيامت کے دن اس کے لئے عذاب ڈال کر دیا جائے گا" — اس کا ایک مفہوم تو یہ لیا گیا ہے کہ یہ عذاب بروحتا چلا جائے گا، اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ ججائے اس کے کہ سزا اور عذاب میں تخفیف یا کمی واقع ہو، اس کی تندی اور سختی میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے، جو اپنے اندر ایک لطیف نکلتے ہوئے ہے۔ بعض حضرات کا یہ گمان ہے کہ عذاب اپنے آخری اور یوم القیام سے قبل عالم بر زخ کے عذاب یا بالفاظ دیگر عذاب پر برکی جو خبریں احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہیں، قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ تو ایسے سب حضرات کے لئے جو قرآن میں ذکر نہ ہونے کی وجہ سے عذاب قبر کو تسلیم کرنے میں متأمل ہیں، یہ مقام بست ہی لائق توجہ ہے۔ فرمایا : «يَنْصُفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ» "وَلَا يَكُرِدُنَّ" "وَلَا گا کر دیا جائے گا اس کے لئے عذاب قیامت کے دن" — اس سے یہ بات آپ سے آپ تکل رہی ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے بھی عذاب موجود ہے، جس کو دو گناہ کرنے یا جس میں اضافہ کرنے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ عذاب ہے جسے ہم عذاب قبر سے تحریر کرتے ہیں اور جس کی خبر نہیں نبی اکرم ﷺ نے احادیث میں دی ہے، اور یہ احادیث محدثین کے مقررہ کردہ سخت سے سخت معیار کے مطابق مستند اور صحیح تسلیم کی گئی ہیں۔

اگر کسی کو یہ ایکال ہو کہ ابھی قیامت کی حدالت تو گئی ہی نہیں، ابھی حساب کتاب اور وزن اعمال تو ہوا ہی نہیں تو اس سے پہلے سزا کیسی؟ تو ان کے اطمینان کے لئے عرض ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اسے خوب جانتا ہے : ﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بِصِرَةٍ﴾ یہ آئت ہم سورۃ القیامہ میں پڑھ چکے ہیں۔ وہ طالب علم جس نے امتحان میں کچھ نہیں کیا، وہ جانتا ہے کہ اس نے پڑھ کیسے کے ہیں۔ چنانچہ امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی اس کی جان سوکھتی رہتی ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری کار کردگی کیا ہے جس کا نتیجہ کے طور پر اعلان ہونے والا ہے۔ نتیجہ کے اعلان کے دن سے پہلے ہی وہ گویا ایک نوع کے کرب اور کوفت کی کیفیت میں جلا ہوتا ہے۔ تو یہی ہے اصل حقیقت کہ اس دنیا سے عالم برزخ کی طرف منتقل ہونے کے فوراً بعد اس تھیز کا ایک عکس انسان کی روح پر پڑنا شروع ہو جاتا ہے جو کچھ اس نے اس دنیا میں کیا ہے۔ یہی ہے وہ بات جس کو نبی اکرم ﷺ نے یوں تحریر فرمایا کہ ”بمرحمت کے باخھوں میں سے ایک باخیچہ یادو زخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے“ — ادھر آنکھ بند ہوئی، ادھر عالم برزخ میں آنکھ کھل گئی، اور اس میں انسان پر ان کیفیات کا ایک عکس پڑنا شروع ہو جاتا ہے جن سے اسے بالآخر پسے اعمال کی پاداش میں قیامت کے دن دوچار ہوتا ہے۔ اس آئت مبارکہ کے ایک حصہ میں کس قدر خوبصورتی سے اس طرف ایک لطیف اشارہ آگیا : ﴿يَضْعِفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمةِ﴾ قیامت کے دن تو عذاب دو گناہو جائے گا، عذاب بڑھ چڑھ کر آئے گا اور پھر انسان اس میں بیشہ بیش رہے گا۔ ﴿وَيَخْلُذُهُمْ مُهَاجِنًا﴾ غلوت اور دوام اس کا مقدار ہو گا اور وہ اس میں رہے گا نہایت ذلیل و خوار ہو کر، رسوا ہو کر۔ اور یہ ذلت بھی دائی ہو گی، اس سے رستگاری ممکن نہیں ہو گی۔ البتہ ایک استثناء ہے جو اگلی آئت میں بیان ہو رہا ہے۔

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَأَمْنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَئِكَ يَتَبَدَّلُ اللَّهُ سَيِّدُهُمْ حَسَنَتْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَشْوُبُ إِلَى اللَّهِ مَقْبَلًا﴾ (الفرقان : ۷۰-۷۱)

”سوائے اس کے جو تائب ہوا اور ایمان لایا اور اس نے اچھے عمل کے تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ بھلا کیوں اور تغییبوں سے بدل دے گا“ اور اللہ

تو ہے یہ مفتر فرمائے والا، رحم فرمائے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے تو وہی ہے جو توبہ کرتا ہے اللہ کی جناب میں جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے۔"

ان دو آیات کا مضمون ان سے پہلی دو آیات سے مریوط ہے، جن میں تین بڑے بُرے گناہوں کا ذکر کیا گیا، یعنی شرک، قتل نافع اور زنا — اور فرمایا گیا کہ جو کوئی ان جرام کا مرکب ہو گا اسے سزا مل کر رہے گی، اور سزا بھی وہ جس میں اضافہ ہو تارہ ہے گا، اور پھر اس کے لئے خلوٰہ یعنی ہمیشہ کے لئے سزا ہے۔ تو یہ نقشہ بعض اعتبارات سے خاصاً مایوسی پیدا کرنے والا ہے کہ اگر کسی شخص سے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا ہو تو ٹوپیا یہ صورت حال اس کے لئے بڑی مایوس کرن ہو گی۔ مایوسی کے اس اندر ہرے میں اگلی دو آیات امید کی ایک کرن بن کر نمودار ہوتی ہیں۔

فرمایا : «إِلَّا مَنْ قَاتَبَهُ إِلَّا جَوَّبَهُ كَرِلَ وَهَذِيْجَيْ جَاءَهُ كَهْ گَنَاهَ كَ اثْرَاتِ اشْيَاءَ كَ مَادِيَ اوْرَ طَبِيعِيَ اثْرَاتِ كَ طَرَحِ نَمِيْسَ ہِیْسَ كَ انَّ كَاظِنُورَ لَازِمَاهُو۔ جِيْسَهْ اگر آپ نے آگ میں انگلی ڈالی تو وہ لازماً جل کر رہے گی۔ اس کے بعد اگر آپ توبہ کریں تو اس توبے سے آگ کا انگلی پر جو اثر ہوا ہے وہ زائل نمیں ہو گا، وہ جلی رہے گی۔ اس لئے کہ یہ ایک طبعی اثر (Physical Effect) ہے۔ لیکن اخلاقی جرام کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اگر کوئی گناہ ہوا ہو، کوئی خطأ ہوئی ہو تو لازم نہیں ہے کہ اس کا اثر ضرور ظاہر ہو۔ بلکہ اس سے بچاؤ کا ایک راستہ ہے، اور وہ درحقیقت توبہ کا راستہ ہے۔ توبہ کی عظمت اور توبہ کی حقیقت کے بیان میں قرآن کا یہ مقام نہایت اہم ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے اس کو قرآن مجید کی چوٹی قرار دینا مخالفت ہے ہو گا۔

پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لجھئے کہ توبہ کی اہمیت کیا ہے؟ انفرادی اعتبار سے بھی یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ اگر انسان اس مغالطہ میں جلا ہو کہ مجھ سے جو خطأ ہو چکی ہے اس کی سزا تو مجھے لازماً بھکتنی پڑے گی، تو انسان پرمایوسی مسلط ہو جائے گی اور اصلاح کے لئے جو بہت اور ارادہ در کارہے، وہ اس میں باقی نہیں رہتے گا۔ چنانچہ کتب احادیث میں ایک بہت بی دلچسپ واقعہ ملتا ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو سنایا۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ متفق علیہ روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو امیں گزری ہیں، ان میں سے کسی امت کے ایک فرد کا یہ واقعہ ہے کہ وہ بڑا سفاک قاتل تھا، اس نے ننانوے انسانوں کو قتل کیا تھا۔ لیکن پھر اس کی طبیعت میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی تو وہ ایک بست بڑے عالم کے پاس گیا اور اس سے کما کہ میں ننانوے انسانوں کو قتل کر چکا ہوں، کیا اب بھی میری مغفرت کا کوئی راستہ کھلا ہے؟۔ اس عالم نے کما کہ نہیں، تمہاری مغفرت کی اب کوئی سبیل نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے اس عالم کو بھی قتل کر دیا کہ میں ننانوے قتل تو پہلے یہ کر چکا ہوں، سو کیوں نہ پورے کرلوں! — پھر اس نے ایک اور بڑے عالم کی طرف رجوع کیا۔ اس نے پتا یا کہ نہیں، اللہ کی مغفرت و رحمت کا دروازہ بھی بند نہیں ہوتا، اگر تم اب بھی صدق دل سے توبہ کرو تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ پھر اس عالم نے اس کی رہنمائی بھی کی کہ فلاں جگہ چلے جاؤ، وہاں تمہیں بہتر احوال ملتے گا۔ تم اب تک جس ماحول میں زر ہے ہو اگر تم اسی میں رہے تو شاید تم اپنی اصلاح نہ کر سکو۔ وہ شخص اپنی اصلاح کے ارادہ سے اس مقام کی طرف جل پڑا جس کی رہنمائی اس عالم نے کی تھی۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کی موت کا وقت آگیا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں فرشتوں کے مابین یہ اختلاف رونما ہوا کہ اس کی روح کو مذہب والے فرشتے قبض کر کے لے کر جائیں یا رحمت والے فرشتے! اللہ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوا کہ راستے ماضی وہ راستے جس طرف وہ اصلاح احوال کی غرض سے قیام کے ارادہ سے چلا تھا اگر اس راستے سے کم رہ گیا ہے جو وہ طے کر چکا ہے تو اس کی روح کو رحمت کے فرشتے لے کر جائیں، بصورت دیگر اس کی روح کو مذہب والے فرشتے لے کر جائیں۔ راستے ماضی اور جس مقام کے ارادہ سے وہ شخص چلا تھا وہ راستے کم پایا گیا، لہذا رحمت والے فرشتے اس کی روح کو لے کر بہذخ کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو وہ راستے جو ابھی طے کرنا تھا تو وہ سست گیا، جبکہ وہ راستے جو وہ طے کر چکا تھا وہ سمجھیل گیا۔

تو یہ ہے توبہ کا محالہ انفرادی اصلاح کے ضمن میں کہ انسان جب بھی جائے، جب بھی ہوش میں آجائے، اگرچہ دل سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی امید دلائی ہے۔ ایک حدیث میں الفاظ آجئے ہیں کہ خواہ اس کے گناہوں کا ذہیر کوہ أحد جتابند ہوتا بھی پھی توبہ کے عوض اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا۔ اور مغفرت کے ضمن میں قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید افراء آمیت سورۃ الزمر کی یہ آیت ہے :

﴿فَلْ يَعْبُدُوا إِلَّا وَنِعْمَةَ اللَّهِ أَنْ شَفَاعَةُ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾

إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْفَقُورُ الرَّّحِيمُ ۝

”(اے نبی) فرمادیجئے کہ اے میرے وہ بندو جنوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت نے مایوس نہ ہو جاؤ! اللہ تمام گناہ بخششے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور وہ ہے ہی بخششے والا، رحم فرمائے والا۔“

دنیا کے دوسرے مذاہب نے اپنے فلسفہ اخلاق میں توبہ کے بارے میں بہت خوب کریں کھائی ہیں جس کے باعث ان کا نقطہ نظر بست کج ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک عقیدہ یہ ہے کہ حضرت آدم ﷺ سے جو خطاب ہو گئی تھی، جب کہ انسیں آزمائشی طور پر جنت میں رکھا گیا تھا اور ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا گیا تھا مگر شیطان کے در غلانے سے انہوں نے اس درخت کے پھل کو کھالا یا تھا، تو یہ گناہ کو یا اب نسل آدم میں منتقل ہو رہا ہے۔ نوع انسانی کا جو بچہ پیدا ہو رہا ہے وہ پیدا گئی طور پر گناہ کار ہوتا ہے، وہ اپنے جدا اجد کے گناہ کی گئنہری لے کر اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ظاہریات ہے کہ جماں یہ ناط عقیدہ ہو گا وہاں اس پر مزید غلطیاں ہوں گی۔ چنانچہ پھر ”کفارہ“ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ یہ بنائے قائد علی القا اسید ہے۔ اس کے بر عکس قرآن مجید یہ بتا کر ہے کہ حضرت آدم علی السلام سے غلطی ضرور ہوئی تھی، لیکن انہوں نے توبہ کی :

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْلَبْنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتُرْحَنْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْغَيْرِينَ ۝﴾

(الاعراف : ۲۳)

”اے رب ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اب اگر تو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر زحم نہیں فرمائے گا تو لازماً ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو

جاںیں گے۔"

اور سورہ البقرہ میں فرمایا :

﴿فَتَلَقَّى آدُمْ مِنْ زَبَّهٖ كَلِمَاتٍ قَاتَبَ عَلَيْهِ﴾

"آدم نے کچھ کلمات اپنے رب سے حاصل کئے (اور جب ان کلمات کے ذریعے اللہ سے توبہ کی) تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔"

مزید یہ کہ توبہ کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی کتب احادیث میں موجود ہے :

﴿الثَّانِيَتُ مِنَ الدَّنَبِ كَمَنٌ لَا ذَلْبَ لَهُ﴾

"بُو کوئی کسی گناہ سے توبہ کر چکا اس کے لئے کوئی گناہ ہے ہی نہیں۔"

کویادہ ایسے ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ لہذا اب اس کا کوئی سوال نہیں ہے کہ نسل آدم ﷺ کا ہر پچھ پیدا کی شی طور پر گناہ گار ہو ————— معاذ اللہ۔ قرآن مجید کا فیصلہ تو یہ ہے :

﴿فَظَرَّتِ اللَّهُ الْجِنِ فَظَرَّ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (الرُّوم : ۳۰)

"اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔"

حضرت ﷺ نے فرمایا :

﴿إِنَّمَا مِنْ مَوْلُودِ إِلَّا يُنَزَّلُهُ عَلَى الْفَطْرَةِ، فَأَبْتَأْهُ إِنْهِيَّ دَائِيَهُ أَوْ يَنْصَرِيَّهُ أَوْ يُمْجِسِيَّهُ﴾ (تَعْلِيْمُ عَلِيِّهِ)

"یعنی نسل آدم کا ہر پچھ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، وہ تو اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی یا نصرانی یا مجوہی بنا دیتے ہیں۔ پس قرآن مجید کے قلخہ میں اور بعض دوسرے مذاہب کے قلخہ میں یہ برا عظیم فرق و تفاوت ہے۔"

اب ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ توبہ کی شرائط کیا ہیں! صرف زبان سے کہہ دینے سے توبہ نہیں ہو جائے گی۔ توبہ کی چند شرائط اور کچھ لو اڑم ہیں۔ اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو چاہے آدمی توبہ کی تسبیح پڑھتا رہے اور صرف زبانی طور پر استغفار کا کتنا ہی ورد کرتا رہے اسے توبہ نہیں کہا جائے گا۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں "ریاض الصالحین" میں توبہ کے باب میں علاجے امت کا اس بات پر

اجماع نقل کیا ہے کہ اگر توبہ کسی ایسے گناہ کے ضمن میں ہو جو حقوق اللہ سے متعلق ہے تو اس کے صحیح ہونے کی تین شرائط ہیں۔ لیکن اگر کوئی گناہ حقوق العباد کے ضمن کا ہے تو ایک اضافی شرط مزید شامل ہو جائے گی۔ پہلی تین شرائط حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں مشترک ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کے دل میں کچی اور حقیقی ندامت ہو کہ میں اب تک جو کچھ کرتا رہا ہوں، غلط کرتا رہا ہوں۔ اس پر واقعی پیشامی ہو۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے نویمی کے دوڑ کے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے، جسے داغ دھلوی نے بہت پسند کیا تھا اور اس پر داد دی تھی کہ ۔

موتی سمجھ کے شان کریں نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اللہ کو بندے کی یہ پیشامی اور ندامت بہت محبوب ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ عزمِ معمتم ہو کہ اب یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا۔ تیسرا شرط یہ ہے کہ فی الواقع اس گناہ کو ترک کر دے اور عمل صالح کی روشن اختیار کرے۔ یہ تین شرائط حقوق اللہ کے ضمن کے گناہوں سے متعلق ہیں۔ — اضافی چوتھی شرط حقوق العباد کے معاملے میں ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی انسان کا حق مارا ہے تو اس کی تلافی کرے، کسی کمال ہڑپ کیا ہے تو وہ مال واپس مکرے یا اس سے معافی طلب کرے، کسی کی غیبت کی ہے تو اس کے پاس جا کر معافی چاہے، کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کے لئے مظلوم سے غنو اور درگزر حاصل کرے۔ اس لئے کہ یہ جو حقوق العباد ہیں انہیں اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اگر اس دنیا میں ان بندوں سے جن کی حقِ مغلی کی گئی ہے معافی حاصل نہیں کی جائے گی تو آخرت میں نیکیوں اور گناہوں کا لین دین ہو گا۔ یعنی ظلم اور زیادتی کرنے والے شخص کی نیکیاں اس شخص کو دے دی جائیں گی جس کے حق پر اس دنیا میں دست درازی کی گئی تھی یا جس پر ظلم کیا گیا تھا۔ اگر زیادتی کرنے والے کی نیکیوں کا سرمایہ ختم ہو جائے گا تو پھر مظلوم کے گناہ ظالم کے وزن اعمال کے پلڑے میں ڈال دیے جائیں گے۔

چنانچہ اس آیت پر فور کچھ ہے فرمایا : ﴿الْأَمْنُ ثَابَتٌ وَالْأَمْنُ وَعِلْمٌ عَمَلٌ أَصْبَالُهَا﴾۔ یہاں صرف ایک لفظ ”ثابت“ نہیں آیا بلکہ اس کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کا ذکر بھی ہے۔ توبہ کے معنی ہیں لوٹنا پلٹنا بر جوع کرنا۔ تو فرمایا : ﴿مَنْ ثَابَ وَأَمْنٌ﴾ ”جو توبہ کرے اور ایمان لائے“۔ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ پسلے کافر تھا، اب ایمان لارہا ہے تو وہ بھی کفر سے پلنے اور ایمان لانے کے اعتبار سے ان الفاظ مبارکہ کے ذیل میں آجائے گا۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ مسلم تھا اور مسلم ہوتے ہوئے بھی گناہ کر رہا تھا تو درحقیقت اس گناہ کی وجہ سے جو قلبی یقین والا ایمان ہے وہ زائل ہو گیا تھا۔ اب جب وہ توبہ کر رہا ہے تو گویا تجدید ایمان کر رہا ہے اور اس کے دل میں از سرنو ایمان داخل ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل سے نکل کر پرندے کے ماندہ اس کے سر پر منڈلاتا ہے۔ اب اگر وہ توبہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل میں لوٹ آتا ہے۔“ لہذا جب دل میں تقدیر قلبی والا اور یقین والا ایمان ہو تو اس کے اثرات لازماً عمل پر مترب ہوں گے اور وہ درست ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے فوراً بعد ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا گیا۔

پھر اس توبہ، تجدید ایمان اور اعمال صالح کے مرتبہ اور مقام کا ذکر بایں الفاظ مبارکہ فرمایا : ﴿فَإِذَا لَيْلَكَ يَتَبَدَّلُ اللَّهُ سَيِّدُهُمْ حَسْنَتٌ﴾ ”پس ایسے لوگوں کے نامہ اعمال میں سے اللہ ان کی برائیوں کو محو فرمائیں کی جگہ یکیوں کا اندر راج فرمادے گا۔“ یہ ہے اللہ کی گناہ میں توبہ کی عظمت۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوا ہے : ﴿وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ ”اور اللہ توبہ ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا“۔ اس کی ذات والاصفات میں مغفرت و رحمت کی شانیں بدرجہ آخر م موجود ہیں۔ لہذا ایک مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ گناہ کی معافی کے لئے اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے لوگوں کے لئے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں، بشرطیکہ وہ اس کی جناب میں پورے لوازم و شرائط کے ساتھ توبہ کریں۔

اگلی آیت میں اس بات کو پھر ذہرا یا گیا۔ عمل صالح توبہ کی شرط لازم ہے۔ انہ ان توبہ توبہ کہتا رہے اور اس کا عمل وعی رہے جو پسلے تھا تو یہ توبہ نہیں ہے، یہ تو اپنے آپ کو

دعا کے دینا ہے۔ بلکہ فرمایا : «وَمَنْ نَابَ وَعِمِّلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُبُّعُ إِلَى اللَّهِ مَقْتَابًا ۝» جو شخص توہہ کرے اور عمل درست کرے توہہ ہے کہ جو اللہ کی جانب میں توہہ کرتا ہے مساکہ توہہ کرنے کا حق ہے۔ ”

عبدالرحمن کے اوصاف کے ضمن میں اگلی آیات میں فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِينَ لَا يُشَهِّدُونَ الرُّؤْرُ وَإِذَا مَرُوا بِاللَّغُورِ مَرُّوا كَيْ أَمَاهَا وَالَّذِينَ
إِذَا ذُكِرُوا بِأَيْمَنِهِمْ لَمْ يَحْزُرُوا عَلَيْهَا صَمًّا وَعَمْبَانًا وَالَّذِينَ
يَقُولُونَ زَيْنًا هَبْ لَنَا مِنْ أَرْوَاحِنَا وَذَرْتُنَا فُرْقَةً أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلنَّمَقَيْنِ
أَمَاهَا وَأَوْلَئِكَ يَحْزُرُونَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلْقَوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً
وَسَلَمًا خَلِدِينَ فِيهَا حَسِنتُ مُسْتَقْرًا وَمُقَامًا﴾

(الفرقان : ٢٧٢)

اور وہ لوگ جو جھوٹ میں شرکت گوا رہنیں کرتے اور اگر اتفاقاً کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ وہاں سے اپنا دامن پھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں، اور وہ جنیں جب اپنے رب کی آیات کے ذریعے سے تذکیر اور نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر گر جیں چلتے۔ اور وہ جو کہتے ہیں : اے ہمارے رب! ہمیں عطا فرماداری یوں یوں اور اولاد سے آنکھوں کی محنتک، اور ہمیں تھنی لوگوں کا امام بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جنیں بد لے میں دیئے جائیں گے بالا گانے بسباب ان کے صبر کے، اور ان کا استقبال ہو گا جتنی میں ذرا اور سلام کے ساتھ۔ رہیں گے وہ اس میں بیشہ بھیش۔ بہت ہی اچھی ہے وہ جگہ مستقل جائے ترار ہونے کے اعتبار سے بھی، اور تھوڑی دیر قیام کے لئے بھی۔ ”

سورہ الفرقان کی مندرجہ بالا آیات میں پھر وہی مضمون آیا ہے جو اس سے پہلے اس روکوئے کی تیری آیت سے لے کر آخر ہوئیں آیت تک آیا تھا۔ یعنی اللہ کے محبوب بندوں کے اوصاف۔ گویا وہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں۔ اس روکوئے کی تیری سے آخر ہوئیں آیت تک چھ اوصاف کا ذکر ہو چکا ہے، جن میں سے پہلا وصف تواضع ہے یعنی وہ لوگ جو زمین پر فروتی کے ساتھ چلتے ہیں، ان کی چال سے عجز و اعکسار اور تواضع کا ظہیر

ہو گا ہے۔ دوسری صفت خواہ مخواہ کی بحث و تجھیں سے دامن بچانا ہے۔ اللہ کے ان محظوظ بندوں سے جب مشتعل مزاج لوگ خواہ مخواہ جنت بازی پر اتر آتے ہیں تو وہ سلام کہ کران سے جدا ہو جاتے ہیں۔ تیرے یہ کہ شب کی عبادت میں اللہ کے محظوظ بندے اپنی راتیں اللہ کے حضور جدے اور قیام میں گزارتے ہیں : ﴿وَالَّذِينَ يَسْتَغْشَى نَفْسُهُمْ سَعْيًا وَقَيْمَانًا﴾ چو تمی صفت جنم سے پناہ مانگتے رہنا یا ان ہوئی کہ اے رب ہمارے؟ ہمیں عذاب جنم سے بچائے۔ ان کی پانچ ہیں صفت میان روی ہے، بالخصوص خرچ کے معاملہ میں : ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا مِمَّا نَسِيرُ فُزُوا وَلَمْ يَنْقُثُوا وَكَانُتِينَ ذَلِكَ فَوَاحِشًا﴾ چھٹی صفت کبیرہ گناہوں سے بچتے رہنا، جس کا ذکر سورۃ الشوریٰ اور سورۃ النجم میں باہم الناظ مبارک آیا ہے : ﴿وَالَّذِينَ يَعْتَبِرُونَ كَبَآتِرَ الْأَثْمَ وَالْفَوَاحِشُ﴾ ”وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بالفعل مجتب رہتے ہیں۔“ اور ہم کئی مرتبہ دیکھ کر ہیں کہ از روئے قرآن مجید کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے اور چوٹی کے گناہ تین ہیں : شرک، قتل بحق اور زنا۔

ان چھ اوصاف کے ذکر کے بعد ایک مخفی بحث توبہ کی عظمت، توبہ کی حقیقت، توبہ کی اہمیت اور توبہ کی شرائط کے بارے میں آگئی تھی۔ اب مضمون پھر اسی سلسلہ تفکوکی طرف لوٹ رہا ہے۔ یعنی عباد الرحمن کے اوصاف کیا کیا ہوتے ہیں۔

یہاں پہلا وصف بیان ہوا : ﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الْمُرْؤُز﴾ ذُرور جھوٹ کو کہتے ہیں اور شہد یشہد کا معنی موجود ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ جھوٹ پر اپنی موجودگی بھی گوارا نہیں کرتے۔ کہیں جھوٹ کا معاملہ ہو رہا ہو، کہیں جھوٹ کی بنیاد پر لین دین ہو رہا ہو، کہیں کوئی سازش ہو رہی ہو، کہیں کچھ جھوٹ گھڑے جارہے ہوں تو ایسی جگہوں پر انہیں اپنی موجودگی تک گوارا نہیں۔ ظاہریات ہے کہ جھوٹی گواہی اس میں از خود آجائے گی۔ جو لوگ جھوٹ میں ادنیٰ درجہ کی شرکت اور شمولیت گوارا نہیں کرتے، وہ جھوٹی گواہی کیوں نکر دیں گے؟

دوسراؤ صفت ہے : ﴿وَإِذَا نَرَوْا إِلَلَغْوٍ مُرْءُوا إِكْرَاماً﴾ یعنی وہ لوگ کہ جن کا

کسی لغو اور بیکار کام کی طرف قصد اور ارادہ کر کے جانا تو سرے سے خارج از بحث ہے ہی، اگر کسی لغو کام پر ان کا اتفاق گزر ہو جائے، مثلاً راہ چلتے ہوئے جب دیکھیں کہ کوئی مداری تماشاد کھارہ ہے تو بھی یہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، بلکہ اپنے دامن کو بچاتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں آپکا ہے : ﴿ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ الْفُوْقَةِ مُغْرِضُونَ ﴾ لیکن یہاں ہو فرق ہے اسے نوٹ کر لیجئے کہ ایک ہے لغو کام کا ارادہ کرنا۔ لیکن یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ اس کا تو سوال ہی نہیں کہ اللہ کے یہ محبوب بندے کوئی لغو اور بے کار کام کریں۔ اگر اتفاقاً بھی کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ باعزم طور پر اپناد امن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اصل میں مومن کو اپنے وقت کی قدر ہوتی ہے۔ یہ محدود سادقت اور محدود ہی فرصت جو اس دنیا میں حاصل ہے یہ بڑی قیمتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے تناخ اس دنیا میں لھلیں گے جو لاحدہ دھے۔ لہذا نتیجہ کے اعتبار سے اس زندگی کا ہر لمحہ امر ہے۔ اس کا شرہ اس زندگی میں ملے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ لہذا ان کے پاس کوئی فال تو وقت نہیں ہوتا کہ اسے بیکار کاموں میں صرف کریں۔

تیرا و صرف یہ بیان ہوا کہ جب انہیں ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے صحیح کی جاتی ہے تو وہ اندر ہے بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے : ﴿ لَمْ يَجِدُوا عَلَيْهَا ضَمَّاً وَعَنِّيَّاتِنَّا ﴾ اس میں کفار کی طرف ایک تعریض ہے کہ انہیں جب آیاتِ الہی سنائی جاتی ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ ان کی خالق پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ وہ غور ہی نہیں کرتے، سنتے ہی نہیں، مدبر ہی نہیں کرتے۔ پہلے ہی سے طے کئے بیٹھے ہوتے ہیں کہ اعتراضات وارد کریں۔ یہ معاملہ مذکورہ بالا اوصاف کے حامل عباد الرحمن کا نہیں ہوتا ہے۔ اس قدر (value) کو اگر ہم ثابت طور پر میں کریں تو وہ یہ ہو گی کہ آیاتِ قرآنیہ پر، آیاتِ ربہ نیہ پر تذہب و تلکر ہو، ان پر غور کیا جائے، انہیں گوشِ حقیقت نیوش سے نہ جائے۔ انسان ان آیاتِ الہیہ کی گمراہیوں میں غوطہ زنی کرے۔

چوتھا و صرف انسانی فطرت سے وابستہ ہے۔ جو شخص خود نیک ہو گا اور سیدھے راست پر زندگی ببر کر رہا ہو گا، لازماً اس کی تمنا ہو گی کہ اس کے اہل دعیٰ ایسی راستے پر چلیں،

اور وہ بھی تقویٰ اور احسان کی روشن اختیار کریں۔ لذاد وہ اپنے رب سے ذعاکرتے رہتے ہیں کہ : «رَبَّنَا هُنَّ أَرْوَاحُ أَجْنَابٍ وَّذِيَّتَافُورَةً أَغْنِينَ» "اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی محض دک عطا فرم۔" ایک مومن کی آنکھوں کی محض دک اسی میں ہے کہ اس کی اولاد بھی ایمان و اسلام اور تقویٰ و احسان کے راست پر گامزد ہو، اس کے گھر میں پرتو تقویٰ کا ماحول ہو۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمارے قریب کے زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی بیانیہ کی مثال بڑی عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹے عطا فرمائے، شاہ عبد القادر، شاہ عبد العزیز، شاہ عبدالغنی، اور شاہ رفیع الدین بیانیہ۔ یہ چاروں نمایت نیک اور نمائیت پار ساختے۔ ان میں سے دو بیٹے تو وہ ہیں (یعنی شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین) جنہوں نے قرآن مجید کے اردو میں اولین ترجمت کئے اور آج تک مستند ترین ترجمے وہی ہیں۔ تیرہ بیٹے نے دہلی میں درس گاہ قائم کی جو مدرسہ شاہ عبد العزیز کے نام سے مشہور ہے جس سے تربیتیں پاک و ہند میں بہت علم پھیلا۔ جبکہ چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی کا نوجوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا، لذاد کسی علی میدان میں ان کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکیں۔ تاہم اس کی سلطانی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمادی کہ آگے ان کے بیٹے شاہ اسماعیل شہید تھے، اور ان کا نام اپنے اس نامور عالم و مجاہد اور شہید بیٹے کی وجہ سے روشن ہوا۔ تو آپ غور کیجئے کہ شاہ ولی اللہ بیانیہ کو اپنی اولاد کو ان کیفیات میں دیکھ کر کس قدر آنکھوں کی محض دک میر آتی ہو گی!

اس کے بعد فرمایا : «وَاجْعَلْنَا لِلنُّفَقِينَ إِمَانًا» اور وہ یہ ذعا بھی کرتے ہیں کہ "ہمیں متقویوں کا امام بنادے۔" ان الفاظ سے یہ مضمون بھی تبادر ہو سکتا ہے کہ یہ ذعاکی جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک لوگوں کا امام اور پیشوائبناے، نیک لوگوں کے آگے چلنے والا بہانے۔ اگرچہ اس کی خواہش رکھنا بھی کوئی بری بات نہیں ہے، لیکن جس سیاق و سماں میں یہ الفاظ آرہے ہیں، اس کے اعتبار سے ان کا مضموم کچھ دوسرا ہے۔ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعے پہلی بات ہی کی مزید تاکید ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص فطری طور پر اپنے اہل دعیاں کا امام ہے۔ قیامت کے روز جب لوگ انھیں گئے تو ان کے پیچھے ان کی

سلیں چلی آرہی ہوں گی، ان کی اولاد و اخلاف ان کے پیچھے چلے آرہے ہوں گے۔ تو گویا دنی بات ذرا اسلوب بدل کر کی گئی ہے کہ اے رب ہم جن کے امام ہیں، ان کو متقیٰ بنا دے۔ ایمانہ ہو کہ ہمارے پیچھے آنے والے، ہماری آئندہ نسلیں فُتّاق و فَارِ پَر مشتمل ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے : ((كُلُّكُمْ زَاعِ وَكُلُّكُمْ مَسْتَغْلِلٌ عَنْ رَعْبِيَّهِ)) یعنی "تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چروائے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے رویڑ کے بارے میں جواب دہے ہے۔" جیسے بھیڑ بکریاں چرانے والا ایک چروائہ ہوا ہے اور چند بھیڑ بکریاں اس کی ذمہ داری ہوتی ہیں، شام کو اگر کوئی بھیڑ یا بکری لوٹ کرنا آئی تو اس سے پوچھا جائے گا، وہ ان کے بارے میں مسئول ہے۔ اسی طرح تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چروائے کی ہے، اللہ نے اپنی خلق میں سے کچھ افراد تمہارے حوالے کر دیئے ہیں، وہ تمہاری بیویاں ہیں، تمہاری اولاد ہیں، وہ تمہارے زیرِ کفالت ہیں، وہ تمہارے زیرِ تربیت ہیں، یہ تمہارا دھن ہے جس کے بارے میں اللہ تم سے پوچھتے گا کہ تم نے ان کی صحیح رخ پر تعلیم و تربیت کا کتنا اہتمام کیا؟ انہیں اللہ کے نیک اور سقی بندے بنانے کے لئے کتنی محنت کی؟ یہ ہے مفہوم اس ارشاد نبوی کا ((كُلُّكُمْ زَاعِ وَكُلُّكُمْ مَسْتَغْلِلٌ عَنْ رَعْبِيَّهِ)) چنانچہ ہر بندہ مومن کی یہ ذمہ اپنی چاہئے کہ اے اللہ، جو گلدار نے مجھے عطا فرمایا ہے، جس کی ذمہ داری تو نے مجھے سونپی ہے، اس کو توفیق دے کہ وہ نیک اور تقویٰ کی روشن اختیار کرے، اور ہم کو ایسے متقیوں کا امام ہاں: ﴿وَاجْعَلْنَا لِلنَّمْتَقِينَ إِنَّمَا أَنْتَ﴾

آگے فرمایا: ﴿أَوْلَئِكَ يَنْجَزُونَ الْفُرْقَةَ بِمَا حَبَرُوا﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جزا کے طور پر جنت میں بالا خانے ملیں گے بسب ان کے صبر کے۔ اس آیت میں گویا عباد الرحمن کا چھٹا اور نمایت اہم و صرف آگیا۔ بِمَا حَبَرُوا یعنی یہ درحقیقت بد لے ہے اس صبر کا جو انہوں نے اللہ کی راہ میں کیا۔ یہ وہ بات ہے جو ہم سورۃ العصر کے ذیل میں بھی پڑھ چکے ہیں اور سورۃ القمان کے دوسرے روکوئے میں بھی کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ﴾ ظاہر ہے کہ یہ تمام اوصاف انہی لوگوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن میں صبر کا مادہ ہو، تبھی وہ دنیوی

لذات و ترنيمات سے کنارہ کشی کر سکیں گے، ہوائے نفس سے احتساب کر سکیں گے، اور شیطان کے انواع سے بچ سکیں گے۔ یہ سب کام اُسی وقت ممکن ہوں گے جب ان میں صبر کا ماڈہ ہو گا۔ پھر دنیا میں تسلی، راست بازی اور صداقت شماری کا راستہ اختیار کرنے والوں کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آکر دے گا۔ ان آزمائشوں پر صبر کے عی وہ برو تقویٰ کی راہ پر مستقیم رہ سکیں گے۔ جیسے سورہ حم الحمد کی آیات میں ہم نے پڑھا تھا: ﴿إِنَّ الْذِينَ قَاتَلُوا زَبَانَ اللَّهِ لَمَّا أَسْتَقْمَاهُوا﴾ تو یہ استقامت اور یہ صبری در حقیقت وہ جو ہر ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان دنیا میں وہ روشن اختیار کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس میں وہ اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں جن کا یہاں ذکر ہوا — اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ: ﴿فَوَيْلٌ لِّلْقَوْنَ فِيهَا نَجْيَةٌ وَسَلْفًا﴾ ”ان لوگوں کا جنت میں استقبال ہو گا ذعاؤں کے ساتھ اور سلام کے ساتھ۔“ ظاہریات ہے کہ یہ استقبال کرنے والے جنت کے فرشتے ہوں گے۔

آگے فرمایا: ﴿خَلِيلِنِنْ فِيهَا﴾ ”اس میں وہ بیشہ بیشہ رہیں گے۔“ جنت وہ جگہ ہے کہ ایک ہارداٹے کے بعد وہاں سے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ﴿خَشْتُ مُشْتَقْرِئًا وَمُقْمَأْمًا﴾ ”وہ جنت بست ہی عمدہ جگہ ہے مستقل رہنے کے لئے بھی اور تحوزیٰ ہی دیر کے قیام کے لئے بھی۔“ اس رکوع میں پہلے جنم کا ذکر آیا تھا، اب یہاں جنت کا ذکر مقابل (contrast) کے طور پر آیا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہمارا تصور یہ ہے کہ کتنی ہی عمدہ جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اس میں انسان کے لئے کوئی دلچسپی اور رعنائی نہیں رہتی اور اگر بُری سے بُری جگہ پر بھی تحوزیٰ ہی مدت کے لئے جانا ہو، جیسے صحرائے عظیم میں انسان تحوزے عرصہ کے لئے چلا جائے تو تبدیلی (change) کی وجہ سے ایک تفریخ ہو جاتی ہے، ایک نرم جوئی کا احساس ہوتا ہے۔ تو جنم کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسی بُری جگہ ہے کہ مستقل جائے قرار کی حیثیت سے تو انتہائی خوفاک ہے ہی، اگر کوئی ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں داخل کر دیا جائے تو اس دوزخ کی تمام شدّت میں غلظتیں اور ساری گلظتیں آئیں واحد میں عیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے بر عکس جنت وہ جگہ ہے کہ وہاں تحوزیٰ دیر ہی نہیں بلکہ مستقل قیام ہو گا، لیکن اس کے حسن میں، اس کی رعنائیوں میں، اس کی دلچسپیوں

میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی اور انسان اس سے کبھی بھی نہیں اکتا گا۔

آخر میں ارشاد فرمایا :

﴿ قُلْ مَا يَنْهَا بِكُمْ رَّبِّنِي لَوْلَا دُعَاوُكُمْ ، لَقَدْ كَذَّبُتُمْ فَتَزُفُّ يَكُونُ
لِرَأْيَهَا ۝﴾ (الفرقان : ۷۷)

”اے نبی نبی! فرمادیجئے : میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ
ہو تو تمہارا پکارنا، سو تم جھلا پکھے ہو، اب اس کی سزا جلد ہی تھیں چٹ کر
رہے گی۔“

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اور اس سورۃ
مبارکہ کی پہلی آیت میں بڑا اگر ارتباط و تعلق ہے۔ پہلی آیت مبارکہ ہے :

﴿ تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ غَنِيمَهٖ لِيَكُونَ لِلنَّاجِعِينَ
تَذَكِّرًا ۝﴾

”بڑی بارکت ہے وہ ہستی جس نے نازل فرمایا الفرقان اپنے بنے پر تاکہ وہ تمام
جان و الوں کے لئے خبردار کرنے والے بن جائیں۔“

ایمانیات کے ذیل میں یہ بات ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ایمان کے تین بڑے بڑے
اجزاء ہیں : (۱) ایمان باللہ یا توحید، (۲) ایمان بالآخرۃ یا معاد، اور (۳) ایمان
بالرسالت۔ سورۃ الفرقان کے آخری روکوں کی پہلی دو آیات ایمان باللہ سے بحث کرتی
ہیں۔ فرمایا گیا : ﴿ تَبَرَّكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاوَاتِ بَرُّوجَ جَآوَ وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَنْزًا
مُبَيِّنًا وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ الْأَنْبَلَ وَالثَّهَارَ جَلْفَةً لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَنْ يَذْكُرَ ۝۵۰﴾
میں نے عرض کیا تھا کہ ان سب کا نتیجہ ایمان باللہ ہے۔ سورۃ الفرقان کی پہلی اور آخری
آیت کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کو کیوں بھیجا رہا! نبوت و
رسالت کی غرض دعایت کیا ہے! سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ میں یہ مضمون بڑی وضاحت
سے اور بڑے واضح الفاظ میں آیا ہے۔ فرمایا :

﴿ رَسُولًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لَنَّا لَيَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ
الرَّسُولِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝﴾

"ہم اپنے رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا ہا کر سمجھتے رہے ہیں تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے یہاں کوئی عندر ہاتھ نہ رہ جائے۔ اور اللہ تو ہے ہی غالب، حکمت والا۔"

علوم ہوا کہ رسولوں کو سمجھتے کا ایک اہم مقصد "امام جنت" اور "قطع عذر" تھا تاکہ لوگ یہ نہ کہ سمجھن کہ اے اللہ! ہمیں پڑھ نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تجھے کون کون سے اوصاف پسند ہیں! ہم جانتے نہیں تھے کہ تو کن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے؟ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں ساعت و بصارت، عقل و شعور اور نیکی و بدی کی تمیز بھی بہت سی چیزوں سے سلح کر کے بھیجا ہے اور یہ بیادی اور ابتدائی جنت ہے جو ہر انسان پر قائم ہے، لیکن امام جنت تب ہوتا ہے جب رسول تشریف لاتے ہیں۔ چنانچہ رسولوں نے حق کو قول اور عمل آپشیش کر دیا۔ حق بولنے کی ترغیب دی تو ساری عمر ج بول کر دکھایا۔ دیانت اور امانت کی تلقین کی تو اپنی زندگیوں میں دیانت و امانت کا نمونہ پیش فرمادیا۔ عدل و قسط کی آکیدہ کی تدوست و دشمن کی تمیزا ایضاً کے بغیر عدل و انصاف کر کے دکھایا۔ عنو و صفحہ کی نیت کی تو اپنے جان کے دشمنوں اور خود اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے والوں کو معاف کر کے دکھایا۔ جو دعوت دی اس کا عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ تو کویا لوگوں پر قول اور عمل آخری درجہ میں جنت قائم ہو گئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو سورۃ النساء کی نہ کورہ بالا آیت میں بیان فرمائی گئی ہے۔

یہی مضمون سورۃ الفرقان کی پہلی آیت میں آیا ہے کہ انبیاء و رسول کی اس مقدس جماعت میں حضور ﷺ کی ایک ایضاً میں آیا ہے۔ پہلے بھی رسول پیغمبر و نبی بن کر آتے تھے لیکن وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف آتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون سکرار کے ساتھ آیا ہے : وَإِلَى عَادٍ أَخَاهُمْ هُؤُذَا..... وَإِلَى نَفْرُوْذَ أَخَاهُمْ صَابِخَا..... اور وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شَعَبَيَّا۔ "قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہو دو کو بھیجا..... قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا..... اور ہم نے مدین (میں رہنے والی قوم) کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا....." چنانچہ مطالعہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ نبی اکرم ﷺ کی بہشت سے قبل نبوت اور رسالت کا معاملہ علاقائی یا قومی ہو تا تھا، لیکن جناب

محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ پر جو نبوت کا اختتام و اتمام ہوا اور رسالت کی تخلیل ہوئی، اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ حضور ﷺ سارے جان والوں کے لئے خبردار کرنے والے بن کر تشریف لائے اور قرآن مجید، فرقان حمید اسی مقصد کے لئے نازل فرمایا کیا:

﴿تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلنَّاسِ نَذِيرًا﴾

یہی بات سورۃ الانبیاء میں باس الفاظ مبارکہ فرمائی گئی: **﴿وَمَا أَزَّ سَلْنَكَ إِلَّا زَحْمَةُ
الْغَلَقِينَ﴾** اور سورۃ سما میں حضور ﷺ کی آفاقی و عالمی شان کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

﴿وَمَا أَزَّ سَلْنَكَ إِلَّا كَافَّةُ لِلنَّاسِ بِشِيزْرَا وَنَذِيرَا﴾

"اور (اے نبی) ہم نے نہیں سمجھا آپ کو مگر تمام لوگوں کے لئے بشیر اور نذیر ہاکر!"

لیکن یہ بات جان پہنچئے کہ رسول یہیش اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہان، دلیل اور پیشہ بن کر تشریف لاتے ہیں، لہذا جہاں رسولوں کی بخشش رحمت ہے وہاں جو انکار کرنے والے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت میں یہی چیز موجب عذاب اور موجب سزا بھی ہے۔ رسولوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس کوئی عذر تو تھا کہ اے اللہ، ہمیں معلوم نہیں تھا، ہم جانتے نہیں تھے کہ تمیری رضا کیا ہے۔ لیکن رسولوں کے آنے کے بعد یہ عذر ختم ہو گیا۔ اب محاسبہ شدید ہو گا اور کچھ سخت ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بار بار ان قوموں کا ذکر ہوا ہے جن کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا، اور جب انہوں نے ان رسولوں کا انکار کیا، ان کی سخن یہ کی، ان کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اور ان چند لوگوں کو جو ان رسولوں پر ایمان لائے تھے بچالیا، اور ان قوموں کو ہلاک کر دیا۔ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اہل عرب کو یہی تنہیہ فرمائی جا رہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے رسول اگر تمہیں دعوت دے رہے ہیں، تبلیغ کر رہے ہیں، تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں، ایک ایک گھر پر جا کر سیخاں، ربانی، پنچارے ہیں، ایک ایک انسان کے دل پر دستک دے رہے ہیں تو میرے رب کو تمہاری کوئی پرواہے۔ ایک ایک کو ہرگز تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں پکارتا اور خبردار کرنا مقصود نہ ہو تو

ہمارے رسول یہ مشقت نہ جھیلتے۔ اس لئے کہ ست اللہ یکی ہے کہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اُسے متنبہ اور خبردار کر دیا جائے، جیسا کہ سورہ نبی اسرائیل میں فرمایا:

﴿وَمَا كَنَّا مُغْنِيِينَ حَتَّىٰ تَعْثَثَ رَضْلَوْنَ﴾

”ہم عذاب نہیں بھیجتے رہے ہیں جب تک رسولوں کو مبعوث نہ فرمادیں۔“

یعنی رسولوں کی آمد کے ذریعے جب تک اتمامِ محنت نہ ہو جائے اس سے پہلے تو میں ہلاک نہیں کی جاتیں۔ لذا یہاں نبی اکرم ﷺ سے کملوا یا جارہا ہے کہ میں نے تم تک تمہارے رب کا پیغام پہنچا دیا، تمہارے سامنے تمہارے رب کی دعوت پیش کر دی۔ مجھ تک ہو ہدایتِ رب اپنی آئی تھی، اسے قول اور عملًا تمہارے سامنے پیش کر دیا۔ یہ تمہارے ہی نفع کے لئے کیا گیا ہے، ورنہ میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے ﴿مَا يَغْبُو إِلَّا كُمْ زَيْنٌ﴾ یہ تبلیغ و دعوت اس لئے ہے کہ تم کو خبردار کر دیا جائے۔ اگر تمہیں پکارنا نہ ہوتا #لزلا ذُعَاؤْ كُمْ #پور شد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہ ہوتی — لیکن ﴿فَقَدْ كَذَّبُتُمْ﴾ ”پس تم جھلا کچے، تم حکم دیب کرچے۔“ عربی زبان میں فعلِ ماضی پر جب ”قد“ کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس میں کسی کام کے ہو جانے میں قطعیت و تختیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں Present Perfect Tense کا بوج مفہوم ہوتا ہے، یعنی کام ہو چکا ہے، بات ہو چکی ہے، یہی مفہوم عربی میں فعلِ ماضی پر ”قد“ کا اضافہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَقَدْ كَذَّبُتُمْ﴾ سو لوگو، تم جھلا کچے ہو۔ اب عنقریب اس کی پکڑ آکے رہے گی ﴿فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَاماً﴾ لازم و ملزم کے الفاظ ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ لیزاما کے معنی ہوں گے جسے کوئی چیز چست کر رہ جائے، چپک کر رہ جائے۔ تو فرمایا: ﴿فَقَدْ كَذَّبُتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَاماً﴾ ”سو تم نے (دعوت) ربانی کو جھلا دیا، پس عنقریب اس کا و بال تم پر لا گو ہو کر رہے گا۔“ تمہیں اس حکم دیب کی سزا مل کر رہے گی۔

یہ آیت مبارکہ نہ صرف ان لوگوں کے لئے بہت اہم ہے جو قرآن مجید کے اوپرین مخاطب تھے اور جن کے سامنے جناب محمد رسول اللہ ﷺ بنی بشیش قبیل خدا کو دعوت پہنچا رہے تھے بلکہ ہمارے لئے بھی بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر

نبوت کا جو انتقام و اتمام ہوا ہے، رسالت کی جو تکمیل ہوتی ہے، اس کا ایک مظروہ ہے جو میں پیش کر چکا ہوں کہ حضور ﷺ کی بخشش پوری نوع انسانی کے لئے ہے۔ اور اسی کا دوسرا مظہر ہے کہ آپ ﷺ کا دور پر رسالت کا قیام قیامت جاری ہے۔ یہ دور جس میں ہم انسان لے رہے ہیں، یہ بھی دور پر رسالتِ نعمتی ہے (علیٰ صاحبہا اللصلوۃ والسلام)۔ ہر انسان جو آج دنیا میں پیدا ہو رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہو گا وہ نبی آخر الزماں ﷺ کی امتی دعوت میں شامل ہے۔ ہاں امتی اجابت میں وہی شامل ہو گا جو نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر بلیک کے "حضور" کی تقدیت کرنے، حضور پر ایمان لائے۔ لیکن امتی دعوت سے خرادوہ تمام لوگ ہیں جن کی طرف کسی رسول کو بھیجا گیا ہو۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام کی امت دعوت قوم عاد تھی، حضرت صالح علیہ السلام کی امت دعوت قوم ثمود تھی، اسی طرح جاتب محمد رسول اللہ ﷺ کی امت دعوت پوری نوع انسانی ہے۔ اور پیغام رب ان کو جس طرح نبی اکرم ﷺ نے بخش نہیں ان لوگوں کو پہنچایا جو آپؐ کے مخاطبین اولین تھے، اسی طرح یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم روئے ارضی پر لئے والے ہر شخص تک اسے پہنچائیں۔ حضور نے تکلیفیں جھیل کر اور مصیبیں اٹھا کر یہ فریضہ دعوت انجام دیا۔ آپؐ کا تصرف و استہزاء بھی ہوا، آپؐ پر پتھراؤ بھی ہوا، آپؐ کے راستے میں کائے بھی بچھائے گئے، آپؐ کی گردان مبازک میں چادر ڈال کر اس طرح مل دیا گیا کہ چشم ہائے مبارک انہی پڑنے کو ہوئیں۔ آپؐ پر کوڑا کر کٹ ڈالا گیا۔ آپؐ کے شابذہ مبارک پر، جبکہ آپؐ سر بہجود تھے، اونٹ کی نجاست بھری او جھڑی رکھی گئی۔ طائف کی گلیوں میں آپؐ پر پتھروں کی اس طور پر بارش ہوئی کہ جد اطرافِ بولمان ہو گیا اور جسم سے خونِ القدس بس بہہ کر نعلیٰ شریف میں جنم گیا۔ یہ ساری تکلیفیں آپؐ ﷺ نے جھیلیں، لیکن دین کا پیغام پہنچا کر جنت قائم کر دی۔

اب یہ کام اُمتی مسلمہ کے ذمہ ہے، میرے اور آپؐ کے ذمہ ہے، حضور ﷺ کے ہر امتی کے ذمہ ہے کہ اللہ کا پیغام ایک ایک فرد و نوع بشر تک پہنچائیں۔ یہ ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ اگر پہنچا دیں تو ہم بریٰ الذمہ ہو جائیں گے۔ جن تک بات پہنچا دی جائے اگر وہ دعوت کو رد کریں اور اس کو قبول کرنے سے انکار کریں تو پھر وہ ذمہ دار

ہوں گے، سارا بوجہ ان پر آئے گا۔ لیکن اگر محالہ وہ ہو جو فی الواقع ہمارا ہے کہ ہم دوسروں تک کیا پہنچائیں آج خود ہم اس بات کے محتاج ہو گئے ہیں کہ قرآن نہیں پہنچایا جائے تو مجرم ہم نہیں گے۔ سو معلوم ہوا کہ ہمارے شانوں پر دو ہری ذمہ داری آگئی۔ جن تک پیغام پہنچانا تھا اگر ان تک پیغام نہیں پہنچ رہا، اذکار نہیں ہو رہا، دعوتِ رب ای کا حق ادا نہیں ہو رہا، تو ان لوگوں کی غلط روی اور گمراہی کا دبالت بھی ہم پر آئے گا۔ اور خود ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ اگرچہ ہم قرآن کے مانے والے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیوں ہیں، لیکن إلَّا مَا شاء اللَّهُ هُمْ عَمَّا تَرَكُنَّ يَصِيبُهُمْ ہوتی ہے کہ کسی نبی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبوت کا غلط دعویٰ کر رہا ہے، جو شکر رہا ہے۔ جیسے ابو جہل اور ابو لب نے حضور ﷺ کی مکذبیب کی — جبکہ ایک مکذب عمل ہوتی ہے کہ ظاہر زبان سے حضور کو نبی اور رسول مان لیا جائے، لیکن آپؐ کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ مکذب عمل کی ایک مثال قرآن مجید میں سورۃ الجعد میں آئی ہے :

﴿ مَقْتُلُ الَّذِينَ حَقَّلُوا النَّفَرَةَ ثُمَّ لَمْ يَخْيِلُوهُا كَمَقْتُلِ الْجَعَنَارِ يَخْيِلُ أَسْفَارًا ۚ إِنَّمَا مَقْتُلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِإِيمَانِ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي إِلَّا قَوْمًا مُّلِيمِينَ ۝ ۵۰﴾

”مثال ان کی جو حال تورات بناے گئے تھے، پھر انہوں نے اس کی ذمہ داری کو ادا کیا، اس گھرے کے مانند ہے جس پر کتابوں کا بوجہ لدا ہوا ہو، اور بہت بری ہے مثال اس قوم کی جس نے آیاتِ الیہ کی مکذبیب کی۔ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

اب آپ اس آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر غور فرمائیے : ﴿إِنَّمَا مَقْتُلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِإِيمَانِ اللَّهِ﴾ ہم سب جانتے ہیں کہ یہود نے زبان سے کبھی تورات کی مکذبیب نہیں کی۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہ مکذبیب کون سی ہے! — یہ مکذبیب در حقیقت مکذبیب عملی ہے کہ تورات کے کتاب اللہ ہونے کا زبانی اقرار تو موجود ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور ظاہریات ہے کہ تورات پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر اس کے احکام پر کاربند نہیں ہیں، اگر تورات کے نواہی سے اعتاب نہیں کیا جا رہا، تو

ذمہ داریاں قورات نے عائد کی ہیں اگر انہیں ادا کرنے سے پھلوٹی کی جاری ہے، "آن سے اغراض برآ جا رہا ہے تو چاہے زبان سے بیود اقرار کرتے ہوں کہ وہ قورات کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں لیکن حقیقت اور عملاً یہ روایہ قورات کی مکذب کے مترادف ہے۔ آج اگر ہم اپنے گربانوں میں جھاگنکیں تو نظر آئے گا کہ بینہ یہی معاملہ ہمارا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں پسلے ہی سے متبرہ فرمادیا تھا۔ بڑی پیاری حدیث ہے جس کا آغاز "بِأَهْلِ
الْقُرْآنِ" کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی "اے قرآن والو!" یہیے قرآن مجید میں یہودو
نصاری سے "بِأَهْلِ الْكِتَابِ" کے الفاظ سے خطاب ہوتا ہے "محبوب رب العالمین" ہم
مسلمانوں سے خطاب فرماتے ہیں "بِأَهْلِ الْقُرْآنِ" کے الفاظ سے — ارشاد ہوئے
ہے : ((بِأَهْلِ الْقُرْآنِ لَا تَنْوَشُوا الْقُرْآنَ)) "اے قرآن والو! قرآن حکیم کو اپنا کیوں
نہ بنا لیتا؟" اسے ایک ذہنی سارانہ بنا لیتا۔ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا۔ — تکمیل پیشہ کے
پیچھے ہوتا ہے، ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو پیشہ کے پیچھے پھینک دو۔ بلکہ تمہارا طرز عمل کیا ہو تو
چاہئے : ((وَأَنْلُوْهُ خَيْرٌ يَلَوْهُ مِنْ آنَاءِ اللَّنِيلِ وَالنَّهَارِ)) "اے پڑھو جیسا کہ اس کے
پڑھنے کا حق ہے، رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی"۔ ((وَالْفَتْنَةُ))
"اے پھیلاؤ" اسے عام کرو، اس کی تبلیغ کرو، اس کے نور سے چار دائیں عالم کو منور
کرو۔ ((وَتَفْتَنُهُ)) "اور اسے خوش الحانی سے پڑھو" کہ اس سے تمہاری روح کو غذا میسر
آئے۔ ((وَتَدَبَّرُوا إِلَيْهِ)) "اور اس میں تدبیر کرو، غور و فکر کرو"۔ وہی بات جو ہم نے اس
رکوع میں پڑھی کہ ﴿وَالَّذِينَ إِذَا ذَكَرُوا إِيمَانَ رَبِّهِمْ لَمْ يَجْزِئُوا عَلَيْهَا حَصَمًا وَعَمَيَانًا﴾
چنانچہ قرآن پر تدبیر ہو، غور و فکر ہو۔ آخر میں ارشاد فرمایا : ((الْعَلَّامُونَ فَلَبِّخُونَ))
"ما کہ تم فلاج پاؤ"۔

پس اگر ہم قرآن مجید کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار نہیں کرتے جس کا حکم نبی اکرم
نبی پیغمبر کی اس حدیث میں آیا ہے تو چاہے زبان سے ہم مانتے ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے، لیکن
حقیقتاً ہم مکذب کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔ اور یہی عملی مکذب ہے۔ اس متن میں
اس آیت مبارکہ کے مخاطبین میں ہم بھی شامل ہیں : ﴿فَلْمَا يَغْبُرُ أَيْكُمْ رَبِّيْنِ لَوْلَا

ذغاوْنُكُمْ ۚ) اے نی! ان لوگوں کے کان کھول دیجئے، انہیں یہ بات سنادیجئے کہ میرے رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے، بلکہ اس نے اگر مجھے مہوت فرمایا ہے، مجھ پر یہ قرآن نازل فرمایا ہے تو صرف اس لئے کہ تم پر ا تمامِ جحث کرنا مقصود ہے۔ لذابیں نے تو تبلیغ کا حق ادا کر کے تم پر جحث قائم کر دی ہے۔ لیکن ﴿فَقَدْ كَذَّبُتُمْ﴾ تم جھلا چکے ہو، تم نے کفر کی روشن اختیار کی ہے۔ خواہ یہ جھلانا قولًا ہو یا عملًا ہو۔ «فَسُوفَ يَنْكُونُ لِزَاماً» پس جان رکو کہ جلد ہی اس کی سزا تم سے چھٹ کر رہے گی۔ اس کی پاداش تم کو جھکتی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ اس انعام بدر سے ہمیں بچائے۔

**بازك الله لي ولهم في القرآن العظيم
ونفعنـي وإياكم بالآيات والذـكر العظيم**



مرکزی انجمن خدمت القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

فیض ایمان — اور — سرخی پر تقدیم

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

ویسیع پیانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشریف و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلم کے فیض عناصر میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک بپاہ جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دو ثانی

کی راہ بھوار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ